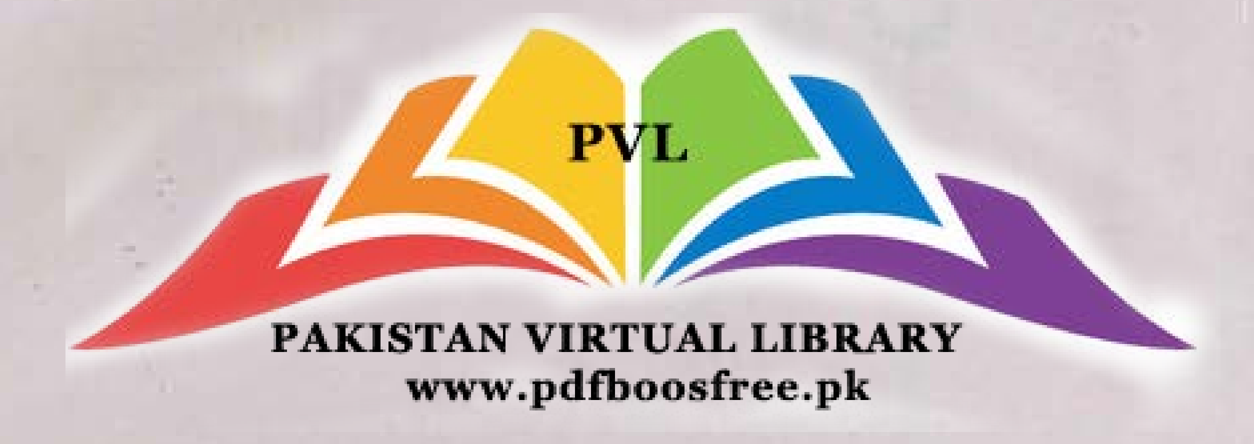

انگلیوں
پر
گنتی کا
زمانہ
PDFBOOKSFREE.PK
صغیر ملال

انگلیوں پر گنتی کا زمانہ

(افسانے)

صغیر ملال

نروان پبلشرز



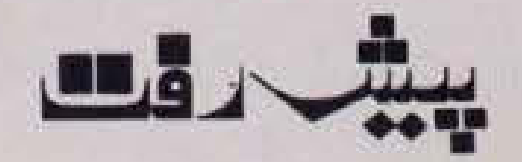
نام کتاب ــــ انگلیوں پر گنتی کا زمانہ (افسانے)
ناشر ــــ محمد عمران افضل
۱۳۶۔سی بلاک ۲۔پی ای سی ایچ ایس۔کراچی ۲۹
طابع ــــ فیروز سنز، کراچی
کتابت ــــ اعجاز کھوکھر، محمد اسلم
قیمت ــــ ۳۰ روپے
تعداد ــــ ایک ہزار
سنِ اشاعت۔ اگست ۱۹۸۳ء

شکیلہ آپا کے نام


ترتیب

– – – – اور رسُولوں اور اولیاء کو غیب سے جو باتیں معلُوم ہوتی ہیں
وہ کبھی تو لکھی ہوئی سطروں کی صُورت میں نظر آجاتی ہیں اور کبھی آوازوں
کی شکل اختیار کر کے انہیں سُنائی دیتی ہیں ــــ کبھی وہ کائنات
کو اس طرح دیکھتے ہیں کہ چیزیں اُن سے بخُوبی کلام کرتی ہیں ــــ
اور کبھی وہ معلّق مثالیں دیکھ لیتے ہیں ــــ

(شیخ الاشراق مقتُول)


پیش رفت

وہ پانی کے ساتھ چلتے چلتے رُک گیا ـــــ یہ مناسب جگہ تھی ـــــ پانی چاند کے ریزہ ریزہ وجُود کے ساتھ اس جگہ پہنچ کر ٹھہر گیا تھا اور اس طرح چاند یہاں اپنی تکمیل کے ساتھ موجُود تھا ـــــ کہیں آگے نشیب میں چاند ضرور ایک مرتبہ پھر بہتے ہوئے پانی کے بھراؤ میں ٹکڑے ہوتا ہوگا مگر اس واٹر پاکٹ کا سامنا کرتے ہوئے یہ محسوس کرنا ممکن نہیں تھا کہ پانی مستقل ایک طرف سے اس میں داخل ہو کر دوسری سمت سے خارج ہو رہا ہے ـــــ

"یہ حشر و نشر کی مثال ہے ـــــ" اُسے ہنسی آگئی ـــــ "یہ کون و فساد ہے ـــــ"

بہرحال یہ اچھی جگہ تھی کہ چاند یہاں مکمل نظر آتا تھا اور اُسے بار بار آسمان کی طرف نظریں اٹھانے کی تکلیف سے نجات مل گئی تھی ـــــ

آسمان کی طرف نظریں اٹھانے کی قباحتوں سے وہ گہری شناسائی رکھتا تھا۔ بعض اوقات آدمی فقط چاند دیکھنا چاہتا ہے مگر ستارے نظر میں مخل ہو جاتے ہیں اور نظارے میں انتشار پیدا کر دیتے ہیں اور ٹھیک سے دیکھنے نہیں دیتے ـــــ اور بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ستاروں کی ترتیب آدمی کو کچھ بتانے کے لئے لب کھولتی ہے تو چاندنی کی شدت مانع آتی ہے اور ٹھیک سے سُننے نہیں دیتی ـــــ

اگر کوئی غور سے دیکھنے والا ہو تو تماشے میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ ایک جیتا جاگتا وجُود

بن جاتا ہے ــــ دھڑکتا ــــ سانس لیتا ــــ گھورتا ــــ کسمساتا ــــ شور مچاتا وجود ۔

اس مقام پہ تماشائی کو ڈرنا نہیں چاہیئے ورنہ تماشے کی جان نکل جاتی ہے ــــ

کچھ کیڑوں مکوڑوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب اُنہیں کسی قسم کا خوف لاحق ہو تو وہ خود پہ مُردنی طاری کر لیتے ہیں اور خطرہ ٹلتے ہی تیز تیز قدم اُٹھاتے کسی تاریک اور محفوظ جگہ کی طرف بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں تاوقتیکہ شرارت کرنے والا بچہ پھر انہیں اُنگلی سے ٹھوکر نہ لگا دے ــــ اس صورت میں وہ ایک مرتبہ پھر مرنے کی اداکاری کرتے ہیں اور اس طرح اپنی جبلتوں اور ذہانت کی انتہا پہ پہنچ کر نوعِ انسانی کے بچوں کی تفریح کا سامان بنتے ہیں ــــ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آس پاس کھڑا کوئی بڑی عمر والا یہ دردناک منظر برداشت نہیں کر پاتا اور کیڑے کی ہمدردی میں شور مچانے لگتا ہے، اور یوں بچوں کو مزید تفریح مہیا ہوتی ہے۔ بعد میں کسی بچے کو خیال آتا ہے کہ اُس بڑے نے جانداروں کو تنگ نہ کرنے والی جو بات کہی تھی وہ تو ٹھیک تھی مگر دوسری صورت میں اُس نے کیڑے کو ایک دم مار دینے کو کیوں کہا تھا؟ ــــ

بچپن میں کہی ہوئی اور سُنی ہوئی باتوں کا ایک مخصوص رنگ ہوتا ہے ــــ جیسے سُرخ پس منظر میں کوئی زرد سا رنگ ہو ــــ یہ رنگ عام حالات میں انتہائی غیر اہم اور مدہم اور پھیکا نظر آتا ہے لیکن برفباریوں کے موسم میں جب آسمان اور زمین کی ہر چیز سفید ہو جاتی ہے یہی غیر اہم اور مدہم اور پھیکا رنگ اپنے مخصوص شوخ سُرخ پس منظر کے باعث آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتا ہے اور یکلخت توجہ طلب اور اداسی کُن اور جھنجھلاہٹ طاری کرنے والا ثابت ہوتا ہے۔ جیسے کوئی فقیر بھیک مانگے اور منع کرنے کے باوجود ہر مرتبہ اپنی ضرورت کو مزید شدّومد سے بیان کرے اور بالآخر پیہم اصرار سے اپنی جانب توجہ مبذول کرائے اور اس طرح جھنجھلاہٹ اور اُداسی کا سامان پیدا کر دے۔ کسی سے بھیک میں کوئی چیز طلب کرنا دُنیا کے دُشوار ترین کاموں میں سے ایک ہے ــــ یہ اور بات ہے کہ کچھ عرصے بعد در بدر صدا لگانے والا خود یہ بھول جاتا ہے کہ ابتدا میں اُسے کتنی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا، جیسے بازاروں میں برہنہ گھومنے والے بہت جلد وہ وارداتِ قلبی

فراموش کر دیتے ہیں جس کے تحت پہلے پہل انہوں نے اپنے کپڑے اُتار پھینکے تھے ۔ پھر ایک دن معاشرے کی تطہیر کے سلسلے میں چلائی جانے والی مہم کے دوران اس طرح کے تمام لوگ عام پکڑ دھکڑ کی زد میں آجاتے ہیں اور نتیجتاً خیرات طلب کرنے والے اور سرِ بازار برہنہ گھومنے والے ایک ساتھ قید کر دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ بھیک مانگنے والے ہر اعتبار سے عُریاں تنوں سے مختلف ہوتے ہیں کیونکہ وہ اکثر اپنے بیوی بچوں اور کُنبے برادری کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں جبکہ الف ننگوں کو اُن کی مائیں فراموش کر چکی ہوتی ہیں۔

اس طرح طبیعتوں میں تضاد رکھنے والے ایک چھت کے نیچے جمع ہوتے ہیں اور دُنیا کے سب سے بڑے عذاب کی مٹی ایک شکل سامنے آتی ہے۔ زیادہ دیر نہیں گذرتی کہ بدرُوحوں اور چھل پیریوں اور اسی قسم کی تمام خباثتوں کا وجود ثابت ہو جاتا ہے اور آدمی کو اپنی نادانی پر ہنسی آتی ہے کہ وہ اب سے پہلے ان تمام موجُودات کو اپنے سے کہیں باہر پائی جانے والی چیزیں سمجھتا رہا تھا۔ پھر اُس کا تمام وقت ان بلاؤں سے لڑتے ہوئے گذرتا ہے اور وہ زیادہ تر خاموش رہنا شروع کر دیتا ہے اور جب اُس کے پُرانے شناسا اُس کی حالت پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں تو وہ مسکرا دیتا ہے اور اس موقع پر نزدیک کھڑا کوئی بچّہ اس ناقابلِ فہم مسکراہٹ کو سرسری طور پر دیکھتا ہے اور اس بات کا گمان تک نہیں کرتا کہ یہ ہنسی زرد رنگ میں ڈھل کر ہمیشہ کے لئے اُس کے لاشعور میں داخل ہو گئی ہے اور کبھی برفباریوں کے موسم میں جب آسمان اور زمین کی ہر چیز سفید ہو جائے گی یہی زرد رنگ اپنے مخصوص شوخ سُرخ پس منظر کے باعث بیک وقت توجہ طلب اور اُداس کُن اور جھنجھلاہٹ طاری کر دینے والا ثابت ہوگا ——

پھر یُوں ہوتا ہے کہ مانگنے والوں کو سماجی انجمنوں کی جانب سے کچھ دے دلا کر اور عُریاں بدنوں کے تن ڈھانک کر چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ صدا لگانے والے بہت جلد صحبتِ ناجنس میں گذارے ہوئے چند عذابناک دنوں کو بُھلا دیتے ہیں اور پُرانی روش پر چل نکلتے ہیں جبکہ برہنہ وار گھومنے والے مزاروں اور خانقاہوں کا رُخ کرتے ہیں اور اس لمحے

تک وہیں رہتے ہیں جب تک سرکاری طور پر عطا ہونے والا کپڑوں کا جوڑا اُن کی ستر پوشی کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے اور پھر ایک دن چرس کے نشے میں اُن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور ہاتھ پاؤں سرد پسینے سے بھیگ جاتے ہیں اور انہیں دُنیا بھر کے خدشات اور اندیشے اور وسوسے لاحق ہو جاتے ہیں اور وہ اس طور طاری ہونے والی وحشت کے زیر اثر دوبارہ بازاروں میں نکل آتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس مرتبہ کپڑوں کی دھجیاں خودٗ بدن سے علیحدہ ہوتی ہیں اور اس عمل میں ان کی کسی قلبی واردات کا دخل نہیں ہوتا کہ جسے وہ وقت گذرنے پر فراموش کر سکیں۔

دل زور زور سے دھڑکنے لگے تو آدمی کا تخیّل بے حد سرکش اور وحشی اور مُنہ زور ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر وہ تمام باتیں ٹھوس اور حقیقی اور کہیں آس پاس موجود لگتی ہیں جو عام حالات میں دُرست محسوس ہونے کے باوجود دُور از کار معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جو چیز ابتدا رکھتی ہے لامحالہ اپنی انتہا پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے اور یہ کہ جہاں آغاز ہے وہاں انجام کی موجودگی ایک لازمی امر ہے۔ مگر کیونکہ دل کی دھڑکنوں کا تیز ہونا بغیر کسی تیاری اور توقع کے دفعتاً وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس لئے جونہی دل اپنے معمول کے مطابق کام شروع کرتا ہے تخیّل کی زرخیزی کوئی نشان چھوڑے بغیر ختم ہو جاتی ہے اور تمام خدشات اور اندیشے اور وسوسے معدُوم ہو جاتے ہیں اور آدمی فراموش کر دیتا ہے کہ کچھ لمحوں کے لئے اُس کی تیسری آنکھ کھُل گئی تھی اور اُس نے زندگی میں پہلی مرتبہ خودٗ کو بیداری کے عالم میں دیکھا اور محسوس کیا تھا۔

اسی لئے سرِ بازار برہنہ گھُومنے والے پہلی مرتبہ روحانی اضطراب میں مُبتلا ہونے کے بعد بقیہ تمام عُمر بھنگ کے پتوں اور چرس کے دھوئیں کے سائیکیڈیلک اثرات کے تحت جسمانی وحشت کا شکار رہتے ہیں اور ہر قدم پہ ہرنوں کی طرح ذرا ذرا سی آواز پہ بدکتے ہیں اور باوجود تمام تر ارادے کے شاخ در شاخ چہکتے پرندوں اور بتدریج کھِلتے پھُولوں کو نظر بھر کر دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے۔ دردناک بات یہ ہے کہ انہیں آخر تک اپنی اس خالص جسمانی کمزوری پر ابتدا،

میں جھلک دکھا کر غائب ہو جانے والی نورانی قوت کا گمان گذرتا ہے۔

جسمانی خوف اور روحانی اضطراب کے درمیان فرق محسوس کرنا اُن ہی کا کام ہے جنہوں نے تمام زندگی خود سے فاصلے پر کھڑے ہو کر خود کو دیکھا ہو۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اعضا میں پیدا ہونے والی روک ٹوک آدمی کے ذہن کو یوں لے ڈوبتی ہے جیسے سانپ ابتدا میں اپنے بدن پر لگنے والی موسیقی کی ضربوں سے غضبناک ہو کر لہراتا ہے اور پھر اس لہرانے کے عمل ہی سے اس پر سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور اس طرح لہرانا پھنکنے سے جھومنے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں سپیروں کے قبیلے کا معتبر ترین فرد بھی یہ بتانے سے قاصر رہتا ہے کہ اب اس کے پالتو کی پھنکاریں جھنجھلاہٹ کا نتیجہ ہیں یا مستی کا اظہار۔

خود سے فاصلے پر کھڑے ہو کر خود کو دیکھنے والے زندگی میں خال خال نظر آتے ہیں مگر جب بھی اس طرح کا کوئی سامنے آکھڑا ہوتا ہے تو آدمی لڑکھڑا جاتا ہے اور اُس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند جاتی ہے اور پتہ نہیں اُس کے اندر کون اُسے بتا دیتا ہے کہ یہ وہی ہے۔ پھر وہ اپنی ساری انفرادیت اور ضد اور خودسری سے اتنی آسانی اور سکون سے دستبردار ہو جاتا ہے اور اپنا سر یوں جھکا دیتا ہے جیسے اس سے زیادہ فطری عمل کوئی نہ ہو۔ اس وقت آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ کسی کی اطاعت قبول کرنا آزادی برقرار رکھنے سے کمتر نعمت ہرگز نہیں ہے۔ یوں بھی اگر آدمی تمام عمر خدائی کرتا رہے تو ایک دن اس کے دل میں بندگی اختیار کرنے کی شدید خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔

خود سے فاصلے پر کھڑے ہو کر خود کو دیکھا جائے تو وجود میں اتنے دھماکے ہوتے ہیں اور ایسی واشگاف تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں کہ آدمی کی قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے اور وہ ایک نیا جنم لیتا ہے جیسے کوئی چیز ساؤنڈ بیریئر کو توڑ کر روشنی کی رفتار کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرے تو ٹوٹ پھوٹ اور دھماکے اُس کی کیفیت اور ہیئت اس طرح بدل دیں کہ آخر کار اُسے وہ چیز ہی نہ رہنے دیں جو چیز کہ وہ دراصل تھی۔

اس نئے جنم میں وہ مخفی قوتیں سطح پر آجاتی ہیں جو آدمی کے گرد نور کا ہالہ اور آگ کا حصار

کھینچ سکتی ہیں اور اس طرح آدمی یا منوّر ہو جاتا ہے اور اپنے نزدیک آنے والی ہر چیز کو روشنی اور سکون اور طمانیت بخشتا ہے اور یوں سجدہ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے یا وہ جل کر راکھ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کھڑکیوں اور دروازوں کی دراڑوں سے آنے والی دھوپ میں اُس کے ذرّات اُڑتے دکھائی دیتے ہیں اور ایٹمی فال آؤٹ کی طرح آس پاس کی اشیا اور جانداروں پر گرتے ہیں اور چہار اطراف کو ناپید کرتے ہیں۔

اس ہلاکت آفرینی سے آدمی کی حیرتِ ثانی کا سامان اُبھرتا ہے جب اُس پر منکشف ہوتا ہے کہ کمتر درجے کی مخلوق زہر آلود اور مہلک فضا میں سانس لینے کی زیادہ اہلیت رکھتی ہے اور آسمان سے برسنے والی جوہری دھول شاید حشرات الارض کو نابود کرنے میں ناکام رہے اور شاید کراہت آمیز وجودوں والے تابکاری اثرات کو اپنے لجلجے جسموں پر انسانوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ آسانی سے برداشت کر لیں اور شاید "کاکروچ" کے اعصابی نظام کی آہنی ساخت اُسے ایٹمی دھماکے میں ریزہ ریزہ ہونے سے بچا لے۔ اس انکشاف کے ساتھ آدمی کو پہلی مرتبہ خیال آتا ہے کہ بالآخر پہلی نظر میں ناچیز دکھائی دینے والی ذی روح اشیا فقط اس لئے تخلیق نہیں ہوئیں کہ اپنی ہوشیاری اور ذہانت کی انتہا پر پہنچ کر نوعِ انسانی کے بچوں کی تفریح کا سبب بنیں بلکہ اپنے اعتبار سے وہ بھی برتری کا شرف رکھتی ہیں اور عین ممکن ہے کہ آئندہ زمانوں میں انسان اُن کی جبلتوں اور محسوسات سے سبق حاصل کرے اور اُن کی تقلید میں خود بھی پیش بینی اور سخت جانی کی جانب پیش رفت کرے۔

اگر کوئی کراہت آمیز چہرہ اور لجلجہ بدن اچانک سامنے آجائے تو آدمی کچھ دیر کے لئے اپنی جگہ پر منجمد سا ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر اس کے قدم یا تو کترا کر آگے نکل جانے کو یا اُس رگ و پے میں تلملاہٹ طاری کر دینے والے وجود کو کچلنے کے لئے اُٹھتے ہیں۔

بہر حال آدمی کیڑوں مکوڑوں کو ترسا ترسا کر مارنا بچپن گزرتے ہی ترک کر دیتا ہے۔

در بدر بھیک مانگنے والے اپنے کپڑوں میں پائے جانے والے جانداروں کو بے شعوری کے عالم میں مسلتے چلے جاتے ہیں اور اُن کا کوئی حساب نہیں رکھتے۔ جبکہ سرِ بازار برہنہ گھومنے

والے اپنے بدن کے کونوں کھدروں اور بالوں میں پرورش پانے والی مخلوق سے بچوں کی طرح کھیلتے ہیں اور اُسے اپنی جان بچانے کے فطری حربے استعمال کرتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور آخر اُسے مُسکرا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے کہ چاہے چند لمحوں کے لئے سہی انہوں نے زندگی میں کبھی نہ کبھی خود سے فاصلے پر کھڑے ہو کر خود کو دیکھا ہوتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ کچھ عرصے بعد وہ اپنی ابتدائی قلبی واردات کو فراموش کر دیتے ہیں اور بقیہ تمام عمر جسمانی وحشت کا شکار رہتے ہیں۔

اسی لئے وہ جاندار جو موسموں کے ساتھ تخلیق پاتے ہیں حیوانیت کی سخت جانی کے باوجود اپنی زندگی کے اختصار سے اُن کو اُداس کر جاتے ہیں ——

گرمیوں کے ابتدائی دنوں میں جونہی سورج کی حیات پرور تپش ایک مرتبہ پھر پھلوں میں رس اور مٹھاس بھرتی ہے اَن گنت مکھیاں اپنی مختصر سی زندگی کے دن پورے کرنے کے لئے نمودار ہو جاتی ہیں اور شہتوتوں کے رس سے مُنہ سُرخ کئے پھرتی ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر گرمی کی شدت میں اضافہ ہونے پر انسانی گھروں کا رُخ کرتی ہیں اور کسی چمکدار دوپہر کو اطمینان سے درمیانی دونوں ٹانگیں زمین سے چپکا کر بقیہ اگلی اور پچھلی دو دو ٹانگوں کی مدد سے اپنے سر اور پروں کی صفائی میں مصروف ہوتی ہیں کہ انجانے میں ایک ایک کر کے کسی لچکدار شے سے مار دی جاتی ہیں یا علمِ کیمیا کی مدد سے کی جانے والی نسل کُشی کا شکار ہو جاتی ہیں اور دوسرے دن گھروں کے باہر اُن کی لاشوں کے انبار دکھائی دیتے ہیں۔ یہی حال مچھروں کا ہوتا ہے —— فرق اتنا ہے کہ وہ اپنی دو دن کی زندگانی میں فقط رات کو خوشحال ہوتے ہیں جبکہ صُبح کے وقت اُن پر شدید پژمُردگی طاری ہوتی ہے اور وہ کالے کپڑوں اور تنگ و تاریک گوشوں میں اپنے تیئں رات کے حوالے کئے رہتے ہیں اور انہی بے بُنیاد عافیت کے حصاروں میں کُچل دیئے جاتے ہیں۔

اسی طرح ساون بھادوں میں مینڈکوں کی آبادی فوارے کی طرح زمین سے اُبل پڑتی ہے۔ ان میں سے اکثر کو دن کے وقت چیلیں اُچک کر لے جاتی ہیں اور انسانی بدن کے افعال اور اعمال سے حیرت انگیز مشابہت رکھنے والوں کو ہوا میں تیرتے ہوئے مزے سے کھاتی پھرتی ہیں۔ باقی ماندہ

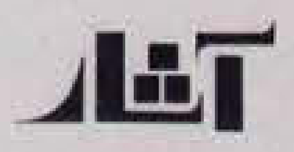
رات کی تاریکی میں کائنات میں کسی قسم کا تغیّر برپا کئے بغیر ہر بھاری چیز کے نیچے دب کر پھٹ جاتے ہیں ۔ ایک عرصے تک اُن کی کھال زمین سے چپکی ہوئی نظر آتی رہتی ہے، اور پھر خاک میں جذب ہو جاتی ہے ۔

یہ بھی آدمی کی نادانی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ پرندے ہمیشہ زمین سے دانے دُنکے چُنتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام دن مٹّی کُرید کر اُس میں پائی جانے والی رنگارنگ مخلُوق کو کھاتے رہتے ہیں جو اُنہی کی طرح ذی شعُور اور ذی رُوح ہوتی ہے ، اور پھر یُوں ہوتا ہے کہ ایک دن کوئی پرندہ مر کر زمین پر آگرتا ہے اور اُسے وہی رنگارنگ ذی شعُور اور ذی رُوح مخلُوق کھا جاتی ہے اور اسی لئے آدمی کوئی نتیجہ نہیں نکال پاتا کہ دراصل کون کس کو کھا رہا ہے ـــــ

اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ جب سے یہاں آکر کھڑا ہوا تھا چاند نے آسمان پر کئی منزلیں طے کر لی تھیں مگر پانی کے اندر اپنی حیثیت اور جگہ برقرار رکھنے کے باعث اُسے ساکت ہونے کا بھلاوہ دینے میں کامیاب ہو گیا تھا ۔ اُسے یاد آیا کہ وہ آج چاند کے ٹکڑے کرنے اور اُس کی ابدیّت خاک میں ملانے کے لئے گھر سے نکلا تھا اور بالآخر اُس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں پر چاند کے ٹکڑے کئے جا سکتے تھے ـــــ

اُس نے جست لگائی اور چاند کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ـــــ




آثار

اس پر نظر پڑتے ہی اُسے یُوں محسُوس ہُوا جیسے سڑک کے کنارے اُبھرے ہُوئے کسی پتھر سے اُسے ٹھوکر لگی ہو۔ کسی نادیدہ چیز سے لگنے والی وہ ٹھوکر عام ٹھوکروں سے اس طرح مختلف تھی کہ اگر اُسے کوئی دیکھ رہا ہوتا تو قسم کھا کر کہتا کہ اس کی پیشانی کسی جُھکی ہوئی ٹہنی سے ٹکرائی تھی یا ہَوا کے دوش پہ لہراتا ہُوا مکڑی کے جال کا کوئی تار اُس کے ہونٹوں سے لپٹتا چلا گیا تھا یا کوئی کیڑا پتنگا پلک جھپکنے سے پہلے اُس کی آنکھ کے مرکزی نقطے سے ٹکرا گیا تھا، اس لئے کہ وہ بجائے جُھکنے کے پیچھے کی طرف جھول گیا تھا اور سُپر مارکیٹ کے برآمدے میں سجے ہُوئے پوسٹروں اور "پن اپس" کے سامنے اس طرح کھڑا ہو گیا تھا جیسے اُس نے "کُن" کی آواز سُن لی ہو اور اب کائنات کی تخلیق کا منظر دیکھ رہا ہو۔

وہ جادُوگری کی حد تک خوبصُورت تھی۔ اُسے یُورپ کے تاریک زمانوں کے عیسائی پادریوں کا خیال آیا جو "چڑیلیں" جلاتے تھے۔ اُس کے کانوں میں کھُدبُد ہُوئی جیسے کوئی ہانڈی اُبل رہی ہو "بڑی آنکھوں والیاں حیا کرتیاں گوریاں، خیموں میں رہتیاں" اسے بارشوں کے موسم میں پہاڑوں پہ متوقع پذیر ہونے والی "لینڈ سلائیڈ" کا خیال آیا، جس کی زد میں آ کر بڑی بڑی چٹانیں اور فلک بوس درخت کیسے شور شرابے اور کتنی آسانی اور مزے کے ساتھ لڑھکتے جاتے ہیں.... لُڑھکتے جاتے ہیں حتیٰ کہ وادی میں بہنے والے دریا میں ایک گونج کے ساتھ ٹھنڈے

ہو جاتے ہیں اور بتدریج مانند پڑتی بازگشت میں پانی کی تہہ سے جا لگتے ہیں اور چٹانیں پُرآسائش سکونت اختیار کرتی ہیں اور درخت بے حد اطمینان اور آرام سے اپنی طاقت کا ایک ذرّہ صرف کئے بغیر بہنے لگتے ہیں۔ ہر پہاڑی سلسلے کی وادیوں میں ایک دلکش، غصیلا اور مستقل مزاج دریا ہوتا ہے۔

ہر چند کہ اُس کے بالوں کی چمک دمک اور لہروں نے اُسے مٹھیاں بھینچنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اُس کے یقین کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ اُس کا معاملہ شک کی حدود تک پہنچانے کی ذمہ دار اُس کی آنکھیں تھیں۔ مصوّروں کی بنائی ہوئی پینٹنگز اور اُن کے ری پرنٹس نے ہمیشہ اُس کے خون میں شدید ارتعاش اور جھنجھلاہٹ پیدا کی تھی۔ اُس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پوسٹر کے کونے پر لکھی تحریر پڑھی اور پیشانی پر پڑنے والی اُسی نادیدہ چوٹ کے اثر سے لڑکھڑا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ فوٹو گراف تھا۔ دوبارہ اُس کی آنکھوں والے حصّے پر نظر ڈالنے کے لئے اُسے اپنا دل مضبوط کرنا پڑا اور اُس کے ساتھ ہی اُسے اپنے ناول کا خیال آیا جس کی تکمیل کے نزدیک اُسے نئے "رائٹنگ پیڈز" خریدنے کے لئے گھر سے نکلنا پڑا تھا۔ تینوں کرداروں پر خاموشی چھا چکی تھی اس لئے کہ گفتگو ایک مرتبہ اپنا دائرہ مکمل کر کے راستوں میں گم کر دینے والے موضوع کی طرف چلی گئی تھی۔ اسی موضوع پر ایک بار پہلے اُس کا سانس اُکھڑ چکا تھا اور وہ قلم ہاتھ سے دھر کر کئی دنوں تک پُرانے شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں گھومتا رہا تھا اور قدیم روایتوں سے آشنا بوڑھوں سے باتیں کرتا رہا تھا اور اپنی پیدائش سے پہلے کے واقعات سنتا رہا تھا۔ تینوں کردار خاموش ہو چکے تھے کہ ایک مرتبہ پھر پاگلوں اور پیغمبروں کی ظاہری اور باطنی نزدیکیاں اور دُوریاں زیرِ بحث آ گئی تھیں۔ آفاقی شعور پیدا ہونے کے بعد عام سطح پر ہوشمند رہنے کے امکانات کا جائزہ! کیا انسانی ذہن "COSMIC - CONSCIOUSNESS" کا متحمل ہو سکتا ہے؟ کیا "SENSE - OF - BEYOND" کا بوجھ فقط اولیاء کی پُختہ اور طاقتور شخصیتیں سہار سکتی ہیں۔ اُس نے اپنے کرداروں کو اُن بے پناہ

آنکھوں کی نمی میں ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ وہ عزقابی سے پہلے اپنے سوالات اُس کی اُن پلکوں کی طرف اُچھال رہے تھے جن کی خمدار انتہائیں کائنات کے ہر پہلو میں دُور دُور تک پیوست تھیں۔ اُس کے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہوئی کہ تیز ہواؤں کے جھکّڑ چلیں اور اُس کی پلکیں دُھول سے اَٹ جائیں اور آنکھیں غیر پاکیزہ چیزوں سے بھر جائیں۔ اُسے الہامی کتابوں میں درج بددُعائیں یاد آئیں اور پیغمبروں کی مجبُوریوں کا اندازہ ہُوا۔

اُس کے ہونٹ ایک بے حد شوخ اور مُبہم اور پُراسرار اور سراسیمگی طاری کر دینے والی مسکراہٹ کی دُھوپ چھاؤں میں نہائے ہُوئے تھے اور تمام اعضائے رئیسہ کے بے روک ٹوک اور مُناسب کام کرنے کی نشاندہی کرتے تھے، اور بدن کی قُوّتوں کی کُھلی فتح کے آئینہ دار تھے اور زندگی کے احساس سے سَرابوُر تھے۔ اُسے پہاڑوں پر بودُوباش رکھنے والی آبادیاں یاد آئیں اور اُن بچّوں کا خیال آیا جو برفباری کے دوران گھروں سے باہر زمین کی رگیں نچوڑ دینے والے موسموں سے بے نیاز اپنے کھیل میں مُنہمک رہتے ہیں اور اُن کے چہرے تازہ اور حرارت بخش خُون کی بُہتات سے میدانوں کے کُھلے آسمان پر چمکتے سورج کی سینہ چاک کر دینے والی دُھوپ میں نمُوپذیر سُرخ گلابوں کی طرح دمکتے ہیں اور وہ برف کے پُتلے بناتے ہُوئے بار بار اپنے ہونٹ اپنی زبان سے چاٹتے ہیں جس سے اُن کے ہونٹوں پر ایک ایسی چمک، ایک ایسی خُوشنما سُوجن نمُودار ہوتی ہے جو پاس سے گذرتے، پناہ گاہوں کی تلاش میں بدحواس اور ہوش گُم کردہ مکّار عمروں والے لوگوں کے قدم روک لیتی ہے اور وہ موم کی طرح پگھل پگھل کر دہیں مُنجمد ہوتے رہتے ہیں۔ اُسے دہکتے ہُوئے سُرخ انگارے یاد آئے جو "جلال" اور "جمال" کا حقیقت میں ایک شے کے دو رُخ ہونے کا بھید اتنی آسانی اور اتنے وقار کے ساتھ ذہن نشین کرا دیتے ہیں کیونکہ وہ خُود فاصلے سے جمال کا مظہر ہوتے ہیں اور چھُونے پر جلال کی مثال بن جاتے ہیں۔" اسے اتنی سُرخ روئی کس بات پر حاصل ہُوئی؟" شاید یہ سمجھ گئی ہے کہ ماہ و سال کا وجُود فقط زمین والوں کی نسبت سے ہے اور ماضی اور مُستقبل انسان کا ذاتی مسئلہ ہے کیونکہ خلا میں "وقت" نام کی کوئی چیز نہیں

پائی جاتی"۔ لیکن اس حقیقت سے آشنائی کسی کے لئے مسرّت کا پیغام کیونکر بن سکتی ہے؟ اُس کے جی میں آئی کہ وہ بڑھ کر اُس کا منہ نوچ لے اور اس مکروہ مسکراہٹ کا خاتمہ کر دے جو حقیقت کے اُدھورے اور خام ادراک سے جنم لیتی ہے اور ناپختہ ذہنوں کو احساسِ کمتری کے عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے اور اُن میں ناتمامی کا شعور بیدار کرتی ہے جس کا خوابیدہ رہنا انسب ہے اور افضل ہے اور موجودات کی حکمتِ عملی کے عین مطابق ہے۔

آگہی چند بے حد مخصوص اور منتخب ذہنوں کی میراث ہوتی ہے جو نیک و بد کے معیاروں سے بلند ہو کر معصوم ہو جاتے ہیں اور غم اور خوشی کی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہتے ہیں۔

اُس کی بانہوں اور ہاتھوں پر نگاہ ڈال کر وہ ایک مرتبہ پھر یوں متحرک ہُوا جیسے اُس کے قدم کسی ٹھوکر سے بے ترتیب ہوئے ہوں اور پیشانی کسی دیوار سے ٹکرائی ہو۔ وہ لڑکھڑاہٹ کے جھکاؤ کو ساتھ لئے پیچھے کی طرف جھول گیا اور پھر جم کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایسی بانہیں تھیں جو زندگی بھر کوئی وزنی چیز نہ اٹھانے سے تشکیل پاتی ہیں۔ ان ہاتھوں کو دیکھ کر لفظ "مشقت" اپنے یکسر تضاد کے باعث یوں یاد آجاتا تھا جیسے چکا چوند پیدا کرتی روشنی میں اندھیرے کا تصوّر اُبھرے یا جیسے ساحل پر ریت کے گھروندے بناتے ہوئے سمندر کی وسعتیں جہازرانوں کی داستانیں یاد دلا دیں اور اچانک بچپن کی جانی پہچانی "زمین" زندگی میں پہلی مرتبہ "خشکی" کی حیثیت سے متعارف ہو۔ اُس کی اُنگلیوں کی ساخت نے اُسے شدید انتشار میں مبتلا کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے خدوخال والیاں عام طور پر خود کفیل ہونے کے ایک ایسے ادنیٰ احساس کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں کہ اُن میں کسی گہرائی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حُسن زیادہ تر اپنے وجود کا اظہار نہیں بلکہ اعلان کرتا ہے جو اعلیٰ ترین سطح پر شوخی اور چنچل پن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اُس کی انگلیاں دیکھ کر کسی ساز کی بے حد باریکیوں سے مچلتی ہوئی تاروں اور موسیقی کی انتہائی لرزہ خیز نزاکتوں کا خیال آتا تھا۔ اُس نے اندرونی انتشار اور دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لئے چند گہرے اور تیز سانس لئے۔

جب ناگواری کی حد تک گہرے سُرخ رنگ اور چمکتے ہوئے وِنڈ بریکر کپڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے لڑکے نے اپنی اسپورٹس موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے پچھلے پہیے پر اُٹھائی تو سپُر مارکیٹ کے سیلز مین نے پہلی مرتبہ اُس اُدھیڑ عمر شخص کو دیکھا جو برآمدے میں دھری رنگین پن اپ تصویروں اور فریم کی ہُوئی ری پرنٹس کے سامنے کھڑا تھا۔

شام گہری اور سرد ہو رہی تھی۔ نوجوان لڑکے اِکّا دُکّا اور ٹولیوں کی صورت میں جنرل اسٹورز اور کپڑوں اور جُوتوں کی دُکانوں کے سامنے ڈیرے ڈال چُکے تھے اور ہر وہ حرکت کرنے میں مصرُوف تھے جس سے شاپنگ کے لئے نکلے خاندانوں کی نوجوان نسوانی مخلوق کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا سکیں۔ پچھلے تین دنوں کی مُسلسل ابر آلُود فضا اور وقفے وقفے سے ہونے والی بارش نے موسم پر خوشگوار اور دُکانداری پر منفی اثر ڈالا تھا جس کی وجہ سے آج چوتھے دن خریدنے اور بیچنے والے دونوں فریقین عام دِنوں سے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ شاہراہ کے مخصُوص فقیر بھی تین دن تک روزینے سے محرُوم رہنے کے بعد اپنے کام میں تندہی سے مصرُوف تھے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ سپُر مارکیٹ کے اُس سیلز مین نے جس کی نوکری اُس کی چرب زبانی کے باوجُود تقریباً ہر ڈیپارٹمنٹ میں سیلف سروس رائج ہو جانے کے باعث خطرے میں تھی اس تصویروں کے سامنے کھڑے شخص کو بھیک مانگنے والوں کے اُس گروہ کا فرد جانا جو اپنے گونگے بہرے ہونے اور دیگر معذوریوں اور مجبُوریوں کی داستان ایک سے زیادہ زبانوں میں چھپے ہُوئے کارڈوں کے ذریعے بیان کرتے ہیں اور اپنے تقسیم کئے ہوئے کارڈ واپس اُٹھاتے ہوئے ان پر پڑی ہُوئی رقم باوقار طریقے سے جیب میں منتقل کرتے ہیں اور کوئی دُعا دیئے بغیر رُخصت ہو جاتے ہیں۔ وہ عُمر کی اُس منزل پر تھا جہاں سر کے درمیانی بالوں کی اکثریت اپنی جگہ خالی کر چکی ہوتی ہے اور کنپٹیوں کے اطراف پر محفوظ رہ جانے والے بال کہیں کہیں سے سفید ہونے لگتے ہیں لیکن داڑھی اور مُونچھیں حسبِ سابق گھنی اور کھری اور سیاہ ہوتی ہیں۔ اُس کے لباس پر کئی جگہ قلم کی سیاہی کے دھبّے تھے اور چند انتہائی

چھوٹے چھوٹے بھورے رنگ کے سوراخ تھے جو چریسیوں یا لاپرواہی سے سگریٹ نوشی کرنے والوں کی قمیضوں پہ پائے جاتے ہیں۔ محدّب عدسوں والی عینک کے پیچھے اُس کی آنکھیں عجیب طرح سے روشن اور خواہ مخواہ متاثر کرنے والی لگتی تھیں۔ مجموعی وضع قطع کے اعتبار سے وہ ان لوگوں سے بھی مُماثلت رکھتا تھا جو سرکس اور نجی محفلوں میں اپنی فنکاری سے جادُو کے کمالات دکھاتے ہیں اور "پروفیسر" کہلاتے ہیں۔

وہ پتہ نہیں کتنی دیر سے اُس غیر ملکی ٹی۔وی اسٹار اور اسٹیج سنگر کی تصویر پہ نظریں گاڑے ہُوئے تھا جو نئی نسل میں بے حد مقبول تھی اور اپنے ملک کے ایک مشہور سیاسی لیڈر سے اس کا "معاملہ" کئی دنوں تک دُنیا بھر کے اخباروں کی زینت بنتا رہا تھا اور اُس سیاست دان کی بدنامی کا باعث ہُوا تھا۔

موٹر سائیکل کے کرتب دکھانے والا لڑکا اس مرتبہ سیٹ پر لیٹ کر دونوں ہاتھ ہینڈل سے اُٹھا کر اپنی گردن کے پیچھے لے گیا تھا اور اب کاروں کے اندر بیٹھ کر فروٹ چاٹ کھانے والی لڑکیاں اپنی پلیٹوں سمیت باہر نکل آئی تھیں اور اُن کے والدین بھی اگلی سیٹوں سے سَر اُٹھا اُٹھا کر اس نظارے سے محظوظ ہو رہے تھے۔

سیلز مین نے دیکھا کہ وہ بدستور تمام ہنگامے کی جانب پُشت کئے ہوئے تھا اور اب تک اُس پوسٹر کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور اس بات سے بھی بے خبر معلوم ہوتا تھا کہ تمام کمرشل ایریا کی بتیاں جل چکی تھیں اور اب وہ تمام تصویریں برآمدے کے بڑے بلب کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔

جب وہ آہستہ آہستہ جھکنا شروع ہُوا تو دُنیا کے دھندوں اور روزمرّہ کی مکرُوہات میں اُلجھے ہُوئے سیلز مین کو، جو شاپ لفٹرز کو موقعے پر پکڑنے میں مہارت رکھتا تھا، احساس ہُوا کہ وہ مُشتبہ حُلیے کا آدمی پوسٹر چُرانے کے بجائے اُسے پھاڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اگر بات یہی ہوتی اور یہیں تک رہتی تو وہ خود اُسے دبوچ لیتا مگر جب جُھکتے

جُھکتے رکوع کی حالت میں جانے کے بعد اس نے اپنے ہاتھ بجائے تصویر کی جانب بڑھانے کے زمین پر ٹیک دیئے اور ایسا انداز اختیار کر لیا جیسے کوئی سجدے میں جانے والا ہو یا سجدہ کرنے کے بعد اُٹھ رہا ہو تو اُسے اچانک یاد آیا کہ یہ وہی شخص ہے جو چند ہفتے قبل اُن کی دُکان پر ایک زمانے سے پڑا ہُوا گوتم بُدھ کے ڈھانچے والا قیمتی ڈیکوریشن پیس خرید کر لے گیا تھا اور اُسے یہ بھی یاد آیا کہ خریداری سے پہلے وہ دیر تک اُس مجسّمے کا منہ چڑاتا رہا تھا اور اس کے بارے میں سب کچھ یاد آ جانے کے بعد سیلزمین کو خیال آیا کہ ان چند ہفتوں میں اُس کی داڑھی بے تحاشا بڑھ چکی تھی۔





ایسا نہیں ہُوا تھا ــــــ

ایسا نہیں ہُوا تھا کہ اندھیری رات میں طوفانی بارش کے دوران اُس کا پاؤں کسی بیٹھی ہُوئی قبر پہ جا پڑا ہو اور اُس نے انسانی ڈھانچے کو بجلی کے لشکارے میں کیچڑ اور جنگلی جھاڑیوں کی جڑوں میں لتھڑے ہُوئے دیکھ لیا ہو ــــ اور ایسا بھی نہیں ہُوا تھا جیسا کہ اکثر ہو جاتا ہے کہ سواریوں سے لدی ہُوئی کوئی بس، چلانے والے کی لمحے بھر کی غفلت سے کسی کم گنجائش اور تیکھے پہاڑی موڑ سے اُلٹ گئی ہو اور نتیجتاً اُس نے مسخ شُدہ چہروں اور کچلے ہُوئے بازوؤں اور ٹانگوں کو گھاٹی کی چٹانوں سے چپکے ہُوئے یا وادی میں بہتی ندی کے بلند آواز سے ماتم کرتے پانی میں دُور تک تیرتے دیکھ لیا ہو ــــ ایسے حادثے کے بعد برسہا برس تک چرواہوں کو دُشوار گزار راستوں اور کھائیوں سے مرنے والوں کے بکسوں کی ٹین اور تالے اور ہڈیاں اور دانت اور چُوڑیاں اور سکّے وغیرہ ملتے ہیں اور وہ دبا دینے والی چیزوں کو دباتے اور جمع کرنے والی اشیا کو اپنے کسی کام نہ آنے والے خزانے میں جمع کرتے چلے جاتے ہیں۔

بہرحال ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی ــــ اور جو کچھ ہُوا تھا وہ یُوں تھا کہ جب وہ رات کے کھانے کے بعد سونے سے پہلے کُتّے کو ساتھ لے کر کھیتوں میں آخری ہشکارا لگانے گیا تو اُس نے ڈاکخانے والے پہاڑ کی چوٹی سے ہَوا میں بھنور پیدا کر کے نیچے آتی ہُوئی انسانی آواز سُنی تھی۔

کوئی اُس کے گاؤں والوں کو کسی کے مرنے کی خبر دے کر تجہیز و تکفین کے وقت سے مطلع کر رہا تھا۔۔۔

وہ اواخر اگست کی ایک انتہائی خوشگوار رات تھی ۔۔۔ آسمان بالکل صاف تھا اور پوری وادی ان گنت ستاروں کی پلکیں جھپکا دینے والی سفید روشنی سے بھری ہوئی تھی ۔۔۔ ماحول میں بھادوں کے ابتدائی دنوں کا مخصوص سکوت اور حبس پھیلا تھا ۔۔۔ خاک کی چادر تلے زندگی بسر کرنے والی مخلوق رات کے اندھیرے کی آڑ ملنے پر جھاڑیوں اور درختوں کی شاخوں سے لپٹی تازہ ہوا میں سانس لے رہی تھی اور مٹی کی مار ڈالنے والی نمی سے نجات ملنے پر مترنم بے اختیاری میں مصروف تھی ۔ چاروں طرف سے حشرات الارض کی پھنکاروں اور سسکیوں اور سرسراہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ شروع تاریخوں کی باریک گولائی کا چاند میدانوں پر اب تک چمک رہا تھا مگر فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا ۔ علاقے کی واحد سالانہ فصل تیاری کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی ۔ بچوں والے گھرانوں نے کمروں کے اندر کھانا پکانا شروع کر دیا تھا مگر زیادہ تر خاندان ابھی تک صحن والے چولہے استعمال کر رہے تھے ۔ بڑے بوڑھے رات کے کھانے کے بعد چولہوں کے گرد بیٹھے میدانوں میں ہونے والی ساون کی بارشوں کی تباہ کاریوں کو موضوعِ گفتگو بنائے ہوئے تھے ۔ دُور دُور سے کتوں کے بھونکنے اور فصل کو نقصان پہنچانے والے جانوروں کو ڈرانے اور بھگانے کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ وہ خود ابھی ابھی نادیدہ ریچھ کو اپنے خون پسینے سے سینچی ہوئی مکئی کی اکلوتی فصل سے پرے رکھنے کے لئے چیخا اور ناچا تھا اور دوبارہ شور مچانے کے لئے سانس درست کر رہا تھا کہ پہاڑ کی آبادی والی سمت سے وہ انسانی آواز سنائی دی تھی جو کسی کے مرنے کی خبر دریا کے دہانے کے ساتھ بسنے والے دیہاتوں تک پہنچا رہی تھی ۔۔۔

جواب میں اُس کے گاؤں کے ایک معتبر آدمی نے کسی اونچی آواز والے کے ذریعے پیغام پہنچانے والے سے رابطہ قائم کیا تھا اور اُس سے جنازہ اُٹھنے کے وقت کے سلسلے میں

بات کی تھی ـــــ

اُس نے مکئی کی فصل میں کھڑے کھڑے مُنہ اُونچا کر کے دونوں آوازیں سُنیں ـــــ

اُس کی آنکھوں کے عین سامنے ستارے ناچ رہے تھے۔ فضا میں آوازوں کے معدُوم ہو جانے کے بعد بہت دیر تک وہ ساکت و جامد یونہی چہرہ اُوپر کی جانب کئے ستاروں کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے گردن میں خم آ جانے کے خوف سے جھُرجھُری لی اور سیدھے ہو کر اپنے کُتّے پر نظر ڈالی جو دُور دراز کے دُوسرے سہمے ہُوئے کُتّوں کے ہمراہ رات کے اس لمحے انسانی آوازوں کے غیر معمُولی تبادلے پر اب تک تشویش کا اظہار کر رہا تھا ـــــ

وہ مرنے والے کو بخُوبی جانتا تھا ـــــ

اس کے بچپن میں ایک مرتبہ ڈاکخانے والے پہاڑ کی پرلی سمت بسنے والے برف باری کے دوران ہرنوں کا تعاقب کرتے نیچے کے پہاڑوں پر اُترے تھے تو نچلے دیہاتوں کی تمام مردانہ آبادی نے ناکہ بندی میں اُن کا ساتھ دیا تھا ـــ شدید برفباری کے خوف سے مائیں اپنے بچوّں کو دُہائیاں دے کر روکتی رہ گئی تھیں مگر اُن میں سے اکثر تو چاول کے پودے کی رسّیاں بھی پاؤں کے گرد لپیٹنے کے لئے نہیں رُکے تھے ـــ وہ جانتے تھے کہ برفباریوں کے دنوں کے علاوہ ہرن کبھی وادیوں میں نہیں اُترتے اور چوٹیوں پر شکار کے لئے جانے کو ابھی ایک عمر کا انتظار باقی تھا ـــ

تمام جنگل برف سے اٹا ہُوا تھا اور زمین اور آسمان کے بیچ، سفید کے علاوہ کوئی دُوسرا رنگ نظر نہیں آتا تھا ـــ وہ ندی کے اُوپر جمی برف پہ چلنے لگے تھے کہ اُس موسم میں چوٹی کی طرف جانے کا واحد کُھلا راستہ وہی رہ جاتا تھا ـــ ابھی وہ جھنڈے والی پہاڑی کے عقب میں پہنچے تھے کہ ہرنوں کی ڈار چوکڑیاں بھرتی اُن کے سامنے آ گئی تھی ـــ سوائے ایک زخمی ہرنی کے جو تین ٹانگوں پہ دوڑ رہی تھی بقیہ سارے ہرن بندُوق کی گولیوں کی طرح سنسناتے ہُوئے ان کے پہلو سے گذر گئے تھے اور اُن کے کُتّے برف پر قلابازیاں کھا کر

رہ گئے تھے۔ خود کو اتنے کتوں اور پاگلوں کی طرح شور مچاتے انسانوں میں گھرا دیکھ کر معذور ہرنی کا خوف سے دل پھٹ گیا تھا اور وہ اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے مُردار ہو گئی تھی۔

اس ہنگامے میں اُس نے مرنے والے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اپنے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے دیار کے درخت جیسی کوئی چیز معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے چیخ چیخ کر شکار کا شرعی مسئلہ بیان کیا تھا اور تصدیق کی تھی کہ گولی اللہ کا نام لے کر چلائی گئی تھی اور اُس کے بعد مسلسل تعاقب کیا گیا تھا اس لئے ہرنی حرام موت ہرگز نہیں مری تھی۔

آج مرجانے والے کو اُس دن دیکھ کر اُسے محسوس ہُوا تھا جیسے وہ پہاڑوں جتنا قدیم اور اٹل ہے اور اُس کی آواز سُن کر یوں لگتا تھا جیسے سڑک بنانے والے بارود لگا کر چٹانیں اُڑا رہے ہوں۔ اُس نے مُردار ہرنی کی گردن پر اپنا چھُرا پھیر کر اُسے ذبح کرنے کی رسم ادا کی تھی اور پھر اُسے گاؤں کے موچی کے کندھوں پر ڈال کر اپنے گھر پہنچانے کا حکم دیا تھا۔ موچی کو اُس نے "چمڑے کی اولاد" کہہ کر مخاطب کیا تھا جس پر سب لوگ دل کھول کر ہنسے تھے اور ان ہنسنے والوں میں موچی کے اپنے بیٹے بھی شامل تھے۔ اُس نے انہیں بتایا تھا کہ دراصل وہ نجبہ چوٹی پر جا کر "مارخور" کا شکار کرنے گھر سے نکلا تھا مگر ہرن اُس کے راستے میں آ گئے تھے اور اُن کا تعاقب کرتے ہُوئے اُسے وادی میں اُترنا پڑا تھا۔

جب وہ ندی کے منجمد پانی پر پاؤں دھرتے پلٹے تھے تو انہیں اُس جان لیوا سرد ہوا کا سامنا کرنا پڑا تھا جو جاتے ہُوئے چڑھائی کی مشقّت اور شکار کے ہنگامے کی وجہ سے پس منظر میں کہیں گُم ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس نے اپنے باپ سے جو آج مرجانے والے کے سامنے اُس دن بے حد کم حیثیت ہو کر رہ گیا تھا پُوچھا تھا کہ وہ جو "مارخور" کے پیچھے نجبر چوٹی کی سمت روانہ ہو گیا تھا رات کے وقت برفانی طُوفان کا مقابلہ کیسے کرے گا، اور اس بات پر اُس کے باپ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی حسرت پیدا ہوئی تھی اور اُس نے خلا میں گھُورتے ہُوئے کہا تھا کہ اُس سے ہرگز بعید نہیں کہ وہ نجبر چوٹی سے اپنے لئے ساتویں بیوی شکار کر

لائے ـــــ اس کے بعد گھروں کو پہنچنے تک اُس کے بارے میں تمام لوگوں نے حیرت انگیز روایات بیان کی تھیں جنہیں اُس کا ذہن ایک سنسناہٹ کے ساتھ قبول کرتا چلا گیا تھا اور اُس رات سونے سے پہلے اُس نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر اس ناقابلِ تسخیر شخص کے ساتھ زندگی گذارے گا ـــــ

اُسے خیال آیا کہ اُس دن گاؤں کے جتنے مُعتبر لوگ اُس کے ساتھ گاؤں کو لوٹے تھے اُس کے باپ سمیت سب کے سب مر چکے تھے ـــــ اور وہ تمام عورتیں جو اُس دن اپنے بچوں کے قدموں سے لپٹ کر انہیں برفباری میں باہر نکلنے سے روک رہی تھیں اپنے گھروں کو نئے آنے والوں کے حوالے کر کے خود گھروں سے نکل گئی تھیں ـــــ اور آج وہ بھی کہ جسے دیکھ کر اُسے احساس ہُوا تھا کہ وہ پہاڑوں جتنا قدیم اور اٹل ہے مر گیا تھا ـــــ ختم ہو گیا تھا ـــــ اپنے خیال کی شدّت اور نوکیلے پن سے دہل کر وہ تیزی سے پلکیں جھپکا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پہاڑوں کے نشیب و فراز ستاروں کی بہتی ہُوئی سفید روشنی میں یُوں واضح تھے جیسے سردیوں میں دریا کے شفاف پانی کی تہہ میں بھیانک چٹانیں نظر آتی ہیں اور آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ تہہ میں اتنی مہیب چیزیں ہونے کے باوجود سطح کیسے ہموار ہو جاتی ہے۔ ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی ریچھ انہی چوٹیوں سے نیچے اُترا تھا اور ہزار تدبیروں کے باوجود گاؤں کی واحد سالانہ فصل کو تہس نہس کر گیا تھا ـــــ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اُس نے اتنے سکون اور اطمینان سے فصل کو اُجاڑا تھا جیسے یُوں تباہی پھیلانا اُس کا پیدائشی حق ہو،

یہ سوچتے ہُوئے اُس کے سانس کی آمد و رفت اور دانتوں کے کٹکٹانے کی آواز اتنی بے ربط اور بلند ہو گئی کہ اُس کا کتا حیرت اور خوف سے لرزتی ہُوئی آواز میں غرّانے لگا ـــــ

یکلخت تمام وادی ایک خیرہ کُن روشنی سے بھر گئی تھی اور اُس نے دیکھا تھا کہ تمام خلقِ خُدا اُس کا فیصلہ سُننے کے لئے ہاتھ باندھے کھڑی تھی لیکن ملکہ مکھی مجبُور تھی۔ کیونکہ ریچھ کے تہہ در تہہ اور کُھردرے بالوں پر اُس کی رعایا کی تمام زہریلی قوّتیں بیکار ثابت

ہو چکی تھیں اور وہ بھیانک آواز کے ساتھ اندر جاتے ہوئے سانس کی قوت سے انہیں یکے بعد دیگرے نگلتا جا رہا تھا اور اُن کے جان توڑ شب و روز کا حاصل اُس کی کنڈیالی زبان پر شہد کی صورت میں ٹپک رہا تھا ۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر ہوا میں اُچھلا اور چیخا ۔ "جا تیری تو بڑے ریچھ کی ایسی کی تیسی !" اُس کی آواز اور اُچھل کود اتنی تند اور وحشی ہوتی چلی گئی کہ آس پاس کے درختوں پر رین بسیرا لئے ہوئے پرندے شور مچاتے ہوئے ہوا میں منڈلانے لگے ۔

جب خاندان کے افراد اُس کی مدد کو پہنچے تو وہ اپنا چہرہ ستاروں کی طرف کئے بھینچی ہوئی مٹھیوں کے ساتھ ہوا میں اُچھل اُچھل کر چیخ رہا تھا ۔ "تیری تو بڑے ریچھ کی ایسی کی تیسی ۔"

صبح تک گرد و نواح کے تمام دیہاتوں میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ وہ رات کو آخری پہرے کے دوران ریچھ کے قدموں کی آہٹ سُن کر خوفیا گیا تھا ۔

وہ وقفے وقفے سے آنکھ کھولتا اور دروازے پر ریچھ کو کھڑا دیکھ کر لرزنے لگتا ۔ اُس نے ہر شخص کو خُدا کا واسطہ دے کر درخواست کی کہ وہ کسی طرح ریچھ کو وہاں سے بھگا دے ۔ اُس کو گرمی پیدا کرنے والی چیزوں کے بعد جگر ٹھنڈا کرنے والی غذائیں استعمال کرائی گئیں ۔ مگر اب ریچھ دروازے کے علاوہ روزنوں اور کھڑکیوں سے بھی داخل ہوتا اور چھت کی کڑیوں اور دیوار کی کارنسوں پر دھرے برتنوں کے پیچھے سے جھانکتا تھا ۔ اُس نے عامل مولوی کو بھی ریچھ سے بچنے کا مشورہ دیا اور لحاف سر پہ ڈال کر چارپائی کے اُوپر ہی سجدے میں چلا گیا اور اوندھا پڑے پڑے گاؤں کے اُن لوگوں کے نام لے کر رونے لگا جو مدت ہوئی مر چکے تھے ۔ اُس کے رونے کا انداز اتنا بھیانک اور لرزہ خیز تھا کہ کمرے میں موجود لوگوں کے دل دہل گئے اور برآمدے میں کھڑی عورتوں نے سہم کر بچوں کو اپنے پاس گھسیٹ لیا ۔ مولوی صاحب چونک کر پیچھے ہٹے اور کاندھے پر پڑی چادر سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے خبیث ارواح سے بچنے کی دُعا پڑھنے لگے ۔

ایک لڑکے نے تحصیل کے ہائی اسکول میں تمام ہم جماعتوں کے سامنے اُس کے بیٹے سے کہا ۔ "تیرا باپ بکری کا بچہ ہے کہ ریچھ کا نام سُن کر خوف سے رسّی تڑانے لگتا ہے ۔" اور

اُس کا بیٹا ذلّت اور شرمندگی کی انتہا سے مغلوب ہو کر رونے لگا ــــ

علاقے میں میسّر بہترین علاج کی فراہمی کے باوجود اُس کی حالت بگڑتی چلی گئی ــــ وہ ہر ملنے والے سے اُس کے بزرگوں کا ذکر کرتا، اُن کی خصوصیات اور اوصاف بیان کرتا اور پھر اُن کی موت کے ذکر تک آتے آتے یوُں ہچکیاں لینے لگتا کہ اکثر اوقات اُس کی مزاج پُرسی کو آنے والا خود شرمندہ اور سوُجی ہوئی آنکھیں لئے اپنے گھر کو لوٹتا ــــ حکیم کے جواب دینے کے بعد ایک مرتبہ پھر اُس کا علاج گھریلو خوراکوں اور ٹوٹکوں کے ذریعے نہایت دلجمعی اور توجہ سے کیا گیا، لیکن افاقے کی کوئی صورت نظر نہ آنے پر خاندان کی عورتوں نے چند دنوں تک اُس کے بستر کے گرد بیٹھ کر رونے دھونے کی رسم ادا کی اور پھر اُس کا معاملہ احتیاطاً اور پرہیز کے مضبوط عزم کے ساتھ اللہ توکّلی پر چھوڑ دیا ــــ

صبح ہوتے ہی اُس کی چارپائی صحن میں اخروٹ کے درخت کے نیچے ڈال دی جاتی جہاں سے وہ دن بھر گاؤں کی طرف خالی خالی آنکھوں سے دیکھتا رہتا ــــ بلکتے ہوُئے بچّے، شور مچاتی مائیں ۔ سر پر گھڑے اور بالٹیاں اور ٹین رکھّے پانی کے پھیرے لگاتیں مختلف عمروں کی لڑکیاں ــــ کاندھوں پر کلہاڑیاں اور سروں پر جلانے کی سوُکھی لکڑیوں کے گٹھّے اُٹھائے جنگل سے آتے لڑکے ــــ کھیتوں کے اطراف کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑھ بناتے مرد اور اُن جھاڑیوں اور پتھّروں کی دیواروں کو پھلانگ کر پکتی ہوُئی فصل پر حملہ آور ہوتیں بکریاں اور اُن کا پیچھا کرتے کتّے ــــ ساون کے مہینے کا سر بلند اور گھنا سبزہ کھا کر مست ہوکے سینگوں سے مٹّی اُٹھاتے اور آپس میں زور آوری کرتے بیل اور کھونٹوں میں بندھی یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتیں نمناک آنکھوں والی مسکین گائیں ــــ

اُسے دُور کی آوازیں نزدیک سے اور بعض اوقات نزدیک کی آوازیں دُور سے آتی سنائی دیتیں اور وہ اُن کا موازنہ اور تجزیہ کرتا رہتا ــــ اُن اجنبی پرندوں کی آوازیں جو صرف برسات کے موسم کی وجہ سے اس علاقے کی طرف نکل آئے تھے اور ہر سال کی طرح ان دنوں چوٹیوں سے

دھیرے دھیرے اُترتے جاڑے کے قدموں کی دھمک محسوس کر کے میدانوں کی سمت واپسی کے لیے پر تول رہے تھے اور روز بروز تعداد میں کم ہوتے جا رہے تھے ــــ جنگلی مُرغوں کی بانگیں جو گھریلو مُرغوں کی اذانوں سے زیادہ بلند اور لوچدار ہوتی ہیں اور جن کی آوازوں میں اُس مخصوص جلال کی آمیزش ہوتی ہے جو اُن نسلوں کا خاصہ ہے جنہیں اپنے ہم جنسوں کی طرح انسان کی پناہ میں آنا منظور نہیں ہوتا ــ چار پائی کے آس پاس گھومتی چوزوں والی مُرغی کی مُسرّت اور خوف کی آوازیں ــ کھیتوں میں بولتے تلیّر اور بٹیر ــ درختوں کی شاخوں پر چہکار مچاتیں گھگیاں اور گٹاریاں ــــ شکاریوں کے مُنہ میں پانی بھر لانے والے تیتروں اور چکوروں کے زمزمے ــــ اپنے تسلسُل اور پیچیدگی سے سر چکرا دینے والی ترڈیوں کی آوازیں ــــ فصلوں کا سر جُھکا کر گذرتی ہَوا کی سرسراہٹ ــــ اور ان ساری آوازوں کے پس منظر میں پگھلتی برف سے بھری پہاڑی ندیوں اور وادی میں بہتے تُند خُو دریا کا مُسلسل شور ــــ یہ سب کچھ دیکھنا اور سُننا اُسے اچھا لگتا اور وہ ایک گہری طمانیت کے احساس میں سَرشار ہو کے لہک لہک کر بیت بولنے لگتا ــــ

ایک دن اُسے یُوں گاتے دیکھ کر نمبردار نے اُس کی بیوی سے سرگوشی کے انداز میں کہا ــ "جب ریچھ اس کے دھیان سے ہٹتا ہے تو یہ ٹھیک ہو جاتا ہے ــ اسے کسی طرح یقین دلا دو کہ اس سال نیچے اُترنے والے ریچھ کو جنگل کے سپاہیوں نے ہلاک کر دیا ہے ــــ اس کی طبیعت سنبھل جائے گی ــــ"

وہ اس وقت بہت خوش ہوتا جب ضلع سے آنے والی بس سُرخ مٹّی والے پہاڑ کے عین وسط میں نمودار ہوتی اور اُس کے گاؤں کے لوگ اُس کی چھت سے اپنے تھیلے اور بوریاں اُتارتے کیڑے مکوڑوں کی طرح چھوٹے چھوٹے نظر آتے ــــ بس کچھ ہی دیر میں ڈگمگاتی ہوئی روانہ ہو جاتی اور گھوم کر پہاڑ کی دوسری سمت چلی جاتی اور اچانک سُرخ مٹی والے پہاڑ کے درمیان میں کھنچی ہوئی سڑک کی لکیر اُس کی توجہ مبذول کر لیتی اور پہاڑ کی گولائی پر بہتی

ہُوئی وہ کالی سڑک اُسے یُوں لگتی جیسے کسی تھانیدار نے اپنے پھُولے ہوئے پیٹ پر بیٹی باندھ رکھی ہو ــــــ

ایک دن بس جونہی پھیرا لگا کر سُرخ مٹی والے پہاڑ کی اوٹ میں اوجھل ہوئی اُسے تھانیدار گُل فروش یاد آگیا جو ایک مرتبہ کسی ضلعی مفرُور کا سُراغ لگانے اُن کے گاؤں میں آیا تھا ــــــ واپسی پر وہ ندی پار کرتے ہُوئے اونچائیوں سے اچانک آجانے والے بارانی پانی کے ریلے کی زد میں آگیا تھا ــــ اور کئی دنوں بعد جب باڑ کا پانی اُترا تھا تو اُس کی لاش پانی پر جھکی کانٹے دار جھاڑیوں میں اس طرح اُلٹی لٹکی ہُوئی ملی تھی کہ اُس کا کنارے کی طرف جھُولنے والا بازُو گیدڑ اور نیولے کھا گئے تھے ، اس کے باوجُود لوگوں نے شکر ادا کیا تھا کہ لاش کا زیادہ حصّہ پانی میں ہونے کی وجہ سے جانوروں کی پہنچ سے باہر رہا تھا ورنہ جنگل میں حادثوں کا شکار ہو جانے والے دُوسرے افراد کی طرح گُل فروش کی لاش بھی گیدڑ اور نیولے گھسیٹ کرلے جاتے اور ضلعی حکّام مفرُور کی حمایت میں تھانیدار کو قتل کرنے کے الزام میں مقامی لوگوں پر عذاب نازل کر دیتے ــــــ

تھانیدار گُل فروش جیسے بھاری بھرکم اور توانا شخص کی پھُولی ہُوئی مسخ لاش کی یاد سے اس کے بدن میں جھرجُھری آگئی اور اُس نے کراہت سے فرش پر تھُوک کر اتنی بلند اور کپکپاتی ہُوئی آواز سے ہوا میں گالی دی کہ صحن میں گھُومتی مُرغی نے کٹکٹا کر اپنے چُوزے پَروں تلے دبا لئے ــــــ اُس کی بیوی نے چُولہے کی لپائی چھوڑ کر اُس کی طرف جست لگائی اور اُسے گارے سے بھرے ہاتھوں سے تھام کر تسلّی دی تو وہ اُس کے بازوؤں میں کسمساتے ہُوئے بولا: ــــ

"شہر والے ریچھ کا دھیان پڑتا ہے ــــــ نہ قد نہ بُت ــــ آدمی کے اشارے پر ناچتا تھا ، وہاں کے لوگ تو اُسے کوئی بھلا مانس جناور ہی سمجھیں گے ــــــ"

اُس رات اُسے دو دن کے وقفے کے بعد دورہ پڑا تھا اور حسبِ دستُور اُس کا سارا بدن لکڑی کی طرح اکڑ گیا تھا اور آنکھوں کا کالا حصّہ یُوں کپکپاتا ہُوا پپوٹوں میں گھُستا چلا گیا جیسے کیچوے سورج کی روشنی سے پریشان ہو کر اپنے بدن کو حیران کُن حد تک پھیلا کر دائرہ دار

گیلی زمین کی تلاش میں مُنہ مارتے ہیں اور نمی محسُوس کرتے ہی اپنے لرزتے ہُوئے لجلجے وجُود سے مٹّی کو چیرتے ہُوئے زمین کے اندر غائب ہو جاتے ہیں۔ اُس کی بیٹی اُس کے مُنہ سے اُبل اُبل کر نکلنے والی جھاگ صاف کرتے ہُوئے رو پڑی تھی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ نوچ کر اُسے ریچھ سے پناہ مانگنے کی تلقین کی تھی ـــــ

اس کے بیٹوں اور بھتیجوں نے رات کے وقت اپنے کھیتوں میں کھڑے ہو کر آوازے لگانا اور ٹین کھڑکانا چھوڑ دیا تھا ـ اس لئے کہ اُس کے خونیانے کے پہلے دن ہی حکیم جی نے اُس کے بڑے بیٹے کو نصیحت کی تھی ـــــ "سخت دھیان کی ضرورت ہے ـــــ اب اگر تیرے باپ کے کان میں ریچھ کا نام پڑ گیا تو یا وہ چارپائی پر دَم توڑ دے گا یا اُس کے بدن کے جوڑ اکڑ جائیں گے اور وہ ساری عمر کے لئے تختہ ہو جائے گا ـــــ" گاؤں والے اس سے پہلے خونیا جانے والے کئی مردوں اور عورتوں کو بھگت چُکے تھے اس لئے انہوں نے حکیم کی نصیحت سُنے بغیر از خُود احتیاط برتنی شروع کر دی تھی اور اپنے اَن ڈوغوں کو تقدیر پہ چھوڑ دیا تھا۔ جو اُس کی زمینوں کے ساتھ لگتے تھے اور جہاں سے اُس کے کمرے میں فصل تباہ کرنیوالے جنگلی جانوروں کو کھدیڑنے کے سلسلے میں مچائے جانے والے شور کے جانے کا خدشہ تھا۔ ہر چند کہ اُس کے خونیانے کے بعد ریچھ دو مرتبہ چوٹیوں سے اُتر چکا تھا لیکن دونوں دفعہ دریا کے ساتھ والے کھیت اُس کی خباثت کا نشانہ بنے تھے اور نشیب میں واقع مکانوں سے بلند ہونے والی چیخ و پکار دریا کے شور میں دب کر رہ گئی تھی ـــــ

ایک دن اُس نے اپنی فصل کی کٹائی کے لئے آنے والے لیتروں سے مخاطب ہو کر کہا ـــــ "بات یہ ہے کہ ریچھ سے کسی صورت نہیں بچا جا سکتا ـــــ یہ دُنیا کی ہر چیز پہ حاوی ہے ـــــ اس لئے کہ کوئی جانور گوشت خور ہے تو زمین سے اُگنے والی چیزیں اُس کے لئے دُھول مٹّی کے برابر ہوتی ہیں اور کوئی جڑی بُوٹیوں پر منہ مارنے والا ہے تو ڈھور ڈنگروں کو اُس سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا ـــــ لیکن یہ ایسی بلا بنائی گئی ہے کہ کیڑا پتنگا دانا دُنکا کچھ بھی اس کے

لیے حرام نہیں ــــ یہ ہر چیز کا خاتمہ کر دیتا ہے ــــ"

ایک رات کسی کم ذات نے اگلے موسم میں گھاس کی پیداوار گھنی کرنے کے لئے جنگل کو آگ دکھادی ــ صبح تک آگ کے شعلے سُرخ پہاڑ کی چوٹی کے جنگل کو خس وخاشاک کی طرح راکھ میں تبدیل کرتے ہُوئے ڈھلوانوں میں اُتر آئے ــ چیڑھ، دیار، ٹاہلی، کنُو اور دھمن کے بلند و بالا درختوں کے بعد گرنڈے، آنحے، بھکڑ اور سنتھے کی سخت جان جھاڑیاں بلا امتیاز تڑ تڑ جلنے لگیں ــ پہاڑ کے دامن میں محکمۂ جنگلات کے تنخواہ دار شدّتِ غضب سے لرزتی ہُوئی آوازوں میں آگ لگانے والے کو گالیاں دینے لگے اور انتہائی مستعدی سے جلد بھڑک اُٹھنے والی خشک جھاڑیاں اور درخت کاٹ کاٹ کر آگ کے راستے سے ہٹانے میں مصروف ہو گئے ــــ سپاہیوں کی وردیاں بہت جلد گھاس کے تنکوں، خشک پتّوں اور کانٹوں سے اٹ گئی تھیں اور اُن کے جُوتے پہاڑ کی سُرخ اور گیلی مٹّی سے لت پت ہو گئے تھے ــــ جنگل کا حوالدار جو چھوٹی ندی کے کائی کی سطح والے پتھّروں سے پھسل کر وردی بھڑوا چکا تھا اب اپنے بدن سے کیچڑ صاف کرتے ہُوئے بار بار اعلان کر رہا تھا کہ آنے والے موسم میں کسی گناہ آلُود زندگی بسر کرنے والی ماں کا بیٹا ہی گاؤں والوں کو سرکاری زمین سے گھاس کاٹنے کی اجازت دے گا ــــ

سُرخ مٹّی والے پہاڑ کی سُورج طلوع ہونے والی سمت سے کالا ریچھ گھرے جنگل کو روندتا ہُوا قبرستان والے پہاڑ پر چڑھ رہا تھا ــــ اُس کے غار میں دُھواں بھر گیا تھا ــــ

گاؤں کے مرد آگ سے دہکتے پہاڑ سے مُنسلک اپنے کھیتوں سے پلیار ہٹا رہے تھے ــــ اُن کا گذشتہ تجربہ گواہ تھا کہ فصل اُجاڑنے والے مویشیوں کی راہ روکنے کے لئے سُوکھی ہُوئی کانٹے دار جھاڑیوں سے تعمیر کی جانے والی یہ حفاظتی دیواریں بہت جلد آگ کی اُنگلی پکڑ کر اُسے گھروں تک لے آتی ہیں ــ آگ کے دائرے کے گرد اُڑتے ہُوئے پرندوں کی سراسیمگی اور دہشت دیکھ کر اولاد والی ماؤں کا اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا مُشکل ہو رہا تھا ــ جب

بھی کوئی درخت تڑتڑاتا ہُوا گرتا پرندے اپنا گھر بار شعلوں سے نکال لے جانے کے لئے آخری کوشش کے طور پر اُس پہ جھپٹتے اور آگ کی حدّت محسُوس ہونے پر یوں ہوا میں اُچھل جاتے جیسے زمین سے کوئی فوّارہ پھُوٹ نکلا ہو ــــ

سُرخ مٹّی والے پہاڑ کے بھڑک اُٹھنے کے سبب آج نشیبی گھروں والوں نے بھی اپنے ڈھور ڈنگر قبرستان والے پہاڑ کی سمت ہانک دیئے تھے اور اس وقت بے شمار مویشی سر جھکائے پائمال اور بے ترتیب قبروں کے درمیان اُگنے والی گھاس چرنے میں مصرُوف تھے ــــ وقفے وقفے سے کوئی جانور مُنہ میں اکٹھی آ جانے والی سخت گھاس کو زمین سے اُکھاڑنے کے لئے اپنے سر کو معمُول سے زیادہ جھٹکتا تو اُس کی گردن میں پڑی گھنٹی بہت دلکش انداز میں بج اُٹھتی ــــ اس کے علاوہ تہہ در تہہ بنے ہُوئے پہاڑی قبرستان میں مکمّل خاموشی طاری تھی ــــ

سائے طویل ہونے تک جنگل کے سپاہیوں کی جان توڑ کوششوں کے طفیل تین سمتوں سے آگ کی پیش رفت کے راستے مسدُود ہو چُکے تھے اور چوتھی طرف بارش اور پگھلتی برف کے پانی کی اپنے کناروں سے چھلک کر بہتی ہوئی ندی آگ کے لئے قُدرتی رُکاوٹ تھی ــــ

گاؤں کے معتبر اور سرکاری املاک سے دلچسپی رکھنے والے بُوڑھے گھروں کو آنے سے پہلے رات کے وقت ہَوا کی طاقت سے اچانک بھڑک کر دُور جا گرنے والی چنگاریوں کا مقابلہ کرنے اور بگڑی ہُوئی صُورتِ حال سے نمٹنے کے سلسلے میں اپنے خاندان کے اُن نوجوانوں کو ہدایات دینے میں مصرُوف تھے جنہیں وہ رات بھر کے لئے وہیں چھوڑ کر جا رہے تھے، کہ اچانک قبرستان والے پہاڑ سے کسی بڑے مویشی کے ڈکرانے کی انتہائی بھیانک آوازیں بلند ہُوئیں۔

دُوسری جست میں ریچھ بھُورے بیل کی پشت پر پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب اُس کے کوہان سے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے اکھاڑ کر پھینک رہا تھا ــــ چند ہی لمحوں میں بیل کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ آخری مرتبہ اپنے پھیپھڑوں میں ہَوا روک کر

لرزہ خیز آواز میں ڈکرایا اور ریچھ کو کمر پہ لئے ہوئے بیٹھ گیا ــــ اُس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ سڑک کے مزدوروں نے جو بلندی پر ہونے کی وجہ سے دُور دُور تک دیکھ سکتے تھے بوگے لگا کر گاؤں والوں کو مطلع کیا کہ ریچھ پکے مکان والوں کے بھٹورے کا نقصان کر گیا ہے ــــ مزدوروں کی آوازیں ہوا میں بھنور پیدا کرتیں چاروں طرف پھیل گئیں ــــ پکے مکان والیاں پچھاڑیں کھانے لگیں اور اُن کا باپ جو سُرخ مٹی والے پہاڑ کی آتش زدگی پر صبح سے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور آئندہ ساون میں وہاں اُگنے والی گھنی اور اعلیٰ گھاس کے تصوّر میں مست تھا اچانک اپنے خول سے نکل آیا اور گاؤں کے اُن لوگوں کی عورتوں سے بلند آواز کے ذریعے ناجائز تعلقات قائم کرنے کی دھمکیاں دینے لگا جو رائفلیں خرید کر گھروں میں ڈال لیتے ہیں لیکن پھر کارتوسوں کے لئے رقم خرچ کرنے سے گھبراتے ہیں ــــ

وہ اس تمام ہنگامے سے بے خبر اپنے بستر پر لیٹا کمرے کی دیواروں پر چپاں پرانے اخباروں کے رنگین صفحوں کی تصویریں دیکھ رہا تھا ــــ اُس دن وہ تمام وقت تاثرات سے عاری چہرہ لئے کھڑکی سے سُرخ مٹی والے پہاڑ کے جنگل کو راکھ بنتے دیکھتا رہا تھا اور اس لمحے اپنی خلا بھری آنکھیں دیوار پر گاڑے اُبلتے چاولوں کی پیچھ تیار ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک اُس کی فصل کی کٹائی پر ڈھول پیٹنے کے لئے ڈاکخانے والے گاؤں سے آنے والے میراثی نے اُس کے بڑے بیٹے سے اپنے مخصوص مزاحیہ لہجے میں کہا: ــــ "پکی دیواروں والے اگر اتنا شور قبرستان جا کر مچا دیتے تو مُردے اُٹھ کر ایک طرف کو بھاگ پڑتے اور ریچھ دُوسری طرف کو ــــ" اُس کے بیٹے نے گھبرا کر آنکھ کے اشارے سے اُسے صُورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا مگر میراثی اپنی دُھن میں رواں ہو گیا تھا ــــ بُجھی ہُوئی چِلم لہراتے ہُوئے بولا: ــــ "ہاتھ میں خدا کا نُور ہے ــــ اپنے کانوں سے سُن کر آیا ہُوں ــــ ڈھول سے اُونچا بج رہا ہے بڑی پگڑی والا ــــ ریچھ سُن لے تو بیل سمُوچا اُگل دے ــــ ابھی تو اُس نے پُورا ہضم بھی نہیں کیا ہوگا ــــ"

اُس کی آنکھیں میراثی کی باتوں کی کڑیاں جوڑنے کے عمل میں پھٹتی چلی گئیں اور پھر اُس کی چیخ نے گھر کے درودیوار کو ہلا کر رکھ دیا ـــــ

سب دم بخود ہو کر۔ بچھو کو ایک بچّی قبر پر بیٹھے پنجے چاٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اُس کے کھُردرے بال خون میں لتھڑ جانے کے بعد گچھوں کی صورت میں بدن سے لٹک رہے تھے۔ اگر وہ وقفے وقفے سے جماہی لینے کے انداز میں مُنہ کھول کر اپنے بھیانک دانتوں کی جھلک نہ دکھاتا تو فاصلے سے دیکھنے والے اُسے جنگلی اناروں کا ایک ایسا درخت سمجھتے جو بجائے بیساکھ کے ساون میں سُرخ شگوفوں سے لد گیا ہو ـــــ

شام تیزی سے گہری ہو رہی تھی ـــــ سورج چند لمحے پیشتر دیار کے درختوں والی چوٹیوں پر سُرخ آسمانی آنکھ کی طرح دکھائی دے رہا تھا مگر اب پیڑوں کی پُشت پہ پہنچ کر شاخ در شاخ تقسیم ہو گیا تھا ـــــ سب جانتے تھے کہ رجا ہُوا ریچھ آج تازہ فصلوں کی پرواہ کئے بغیر اندھیرا پھیلتے ہی بادلوں اور برف کی دائمی اوٹ میں رہنے والی اُن چوٹیوں کا رُخ کرے گا جہاں انسانوں کی عملداری باقی نہیں رہتی ـــــ

پکّے مکانوں کے مالک، بڑی پگڑی والے پر رُک رُک کر جنونی کیفیت طاری ہو رہی تھی ـــــ وہ گولیاں نہ رکھنے کے سلسلے میں تمام گاؤں کو گالیاں دیتے دیتے تھک گیا تھا اور اب عورتوں کی طرح اپنے بھُورے بیل کی صفتیں بیان کر کے رو رہا تھا ـــــ "میں کہتا ہُوں ـــــ" اُس کی آواز اُس کے بدن کی طرح کانپ رہی تھی ـــــ "اگر تحصیل کے میدان میں دریا پار کے ٹین کی چھت والے اس کے جواب میں اپنا کوئی جانور نہیں لا سکے تھے تو وہ سارے گاؤں کو شاباشی ہوئی یا نہیں؟"

وہ اندھا دُھند بھاگتا ہُوا اب پگڈنڈی پر آ گیا تھا ـــــ اُونچے نیچے راستوں پر ٹھوکریں لگنے سے اُس کے پاؤں کے کئی ناخن اکھڑ گئے تھے ـــــ خاردار جھاڑیوں اور نوکیلے پتھروں سے تعمیر کی ہُوئی چار دیواریوں کو وہ یُوں روندتا اور پھلانگتا آیا تھا کہ اُس کے کپڑے تار تار

ہو گئے تھے اور بدن جگہ جگہ سے اُدھڑ گیا تھا ۔۔۔ اُس کے گھر کی عورتیں اور بچّے بے پناہ شور مچاتے اُس کے پیچھے بھاگے چلے آ رہے تھے اور اُسے رُک جانے کی قسمیں دے رہے تھے ۔۔۔

گاؤں والوں نے اُسے اس وقت دیکھا جب وہ پہاڑ کے نشیبی علاقے سے پتھروں کی دیوار پھاند کر قبرستان میں داخل ہو چکا تھا ۔۔۔

جب اُس کی بیوی بڑی پگڑی والے کے قدموں میں گری اُسے بچا لینے کی التجا کر رہی تھی وہ ریچھ کو بُرا بھلا کہتا ، اُسے مُکّے دکھاتا اُس کی سمت بھاگا جا رہا تھا ۔۔۔ سوائے اُس کے بیٹوں کے جو دیوار کُود کر اندر چلے گئے تھے اور پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر اُسے واپس آنے کو کہہ رہے تھے ، بقیہ تمام لوگ اپنی اپنی جگہ پتھّر بن چکے تھے ۔۔۔

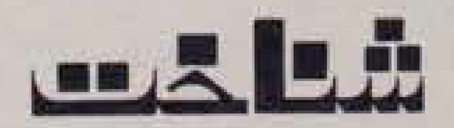
فاصلہ کم رہ جانے پر اُس نے ریچھ کو پتھّر مارے اور اُسے حقیر اور ناچیز اور کم ذات کہہ کر مخاطب کیا اور پھر اُسے دُنیا کی ہر گندی اور غلیظ اور فحش بات کہتے ہُوئے آہستہ آہستہ اُس کی سمت بڑھنے لگا ۔۔۔ اُس نے ریچھ کے دانتوں اور بالوں اور پنجوں کو الگ الگ گالیاں دیں ۔۔۔

آسمان پر اِدھر اُدھر تارے نمُودار ہو رہے تھے اور رات کے تیزی سے گہرے ہوتے اندھیرے میں اب وہ دونوں پرچھائیاں سی نظر آ رہے تھے ۔۔۔

نزدیک پہنچ کر وہ بلند آواز سے روتا ہُوا ریچھ سے لپٹ گیا ۔۔۔

درندے کا پنجہ ہَوا میں لہرایا اور اُس کا وجود کئی حصّوں میں تقسیم ہو کر آس پاس کی قبروں پر بکھر گیا ۔۔۔




شناخت

جب ایک دن اور ایک رات کے بعد کمر کے پیچھے لے جا کر چھت کے کُنڈے کے ساتھ بندھے ہوئے اُس کے بازو کھولے گئے تو وہ تھوڑی دیر سَر سے پاؤں تک لرزتا رہا اور پھر کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر یوں بے حس و حرکت بیٹھ گیا جیسے اگلی سزا جھیلنے کے لئے ہمہ تن تیار ہو گیا ہو۔ پچھلے ایک ہفتے کے دوران وہ اپنے اُوپر کئے جانے والے تشدد کو کچھ اس طرح برداشت کرتا رہا تھا کہ اگر اس معاملے میں اسپیشل پولیس شامل نہ ہو چکی ہوتی تو تھانہ سی ڈویژن کا انچارج اُسے اب تک آزاد کر چکا ہوتا۔ لیکن اسپیشل پولیس کے حوالدار اکبر کو جس کا مجرموں کو اقبالی کرنے کا ریکارڈ سو فیصد تھا پتھر کی سی سختی اور نوکیلا پن رکھنے والے اس شکن آلود اور مفلوک الحال ملزم سے ذاتی نوعیت کی ضد سی ہو گئی تھی۔

"تیرے ساتھ والے اپنا کھایا پیا اُگل کر ایک طرف ہو گئے ہیں ــــ تو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے۔"

یہ بات حوالدار اکبر نے اُس وقت بھی کہی تھی جب اُس نے اُسے اُلٹا لٹا کر چمڑے کے سلیپر سے اتنا مارا تھا کہ اُس کی کھال اُدھڑنی شروع ہو گئی تھی اور یہی بات اُس نے اُس وقت بھی دہرائی تھی جب پیروں کے تلووں پر بید کھانے کے دوران اُس کی ناک سے اچانک خون اُبل پڑا تھا۔

شاہ روشن چراغ کی پہاڑی سے گرفتار کر کے لائے جانے والے اس آخری ملزم نے حسبِ سابق اس مرتبہ بھی اسپیشل پولیس کے حوالدار اکبر خان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

شاہ روشن چراغ کی مقدس پہاڑی پر چھاپہ مارنے کے لئے حکّامِ بالا کی خصوصی اجازت حاصل کی گئی تھی۔

شہر میں یکے بعد دیگرے متعدد ایسی ڈکیتیاں ہوئی تھیں جن کا باوجود کوشش کوئی سُراغ نہیں لگایا جا سکا تھا۔ آخری واردات ایک پٹرول پمپ لُوٹنے کی تھی جس میں کشمکش کے دوران کیشئر کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ تمام وارداتوں کے عینی شاہدوں نے مجرموں کا جو حلیہ بتایا تھا وہ تقریباً یکساں تھا اور ان شہادتوں سے عام توقعات کے مطابق کسی طور یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ مجرم چھوٹی عمروں کے راہ گم کردہ لڑکے ہیں جن کا تعلق عام طور پر بااثر متموّل خاندانوں سے ہوتا ہے اور جو نوجوانی کے بلاخیز جذبوں کے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو تشدّد کے ذریعے بھک سے اڑا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈکیتی میں قتل کی واردات شامل ہونے کے بعد کیس اسپیشل پولیس کے حوالے کر دیا گیا تھا جس نے اپنے مخصوص طریقۂ کار سے تحقیق کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ مجرم واردات کے فوراً بعد شہر کے بھک منگوں اور سڑکوں پر گھومنے والے مخبوط الحواس لوگوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس طرح شہر کے تمام راستوں کی ناکہ بندی کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

جب تفتیش کی بُنیاد ان خطوط پر استوار کی گئی تو شہر کے قبرستانوں اور مزاروں اور رنڈیات کے اڈوں سے مشتبہ حلیوں کے آدمیوں کو گرفتار کرنے کا سلسلہ چل نکلا اور آخرِکار شہر کے نواح میں واقع اس مُقدّس پہاڑی پر چھاپہ مارا گیا جس کے غار میں ایک روایت کے مطابق شاہ روشن چراغ نے کئی سو سال قبل چلّے کاٹے تھے اور تپّیا کی تھی اور جہاں اب علاقے بھر کے چور اُچکّے اور بھک منگے اور مختلف نشوں کے عادی خود کو شاہ صاحب کا نام لیوا اور ملنگ ظاہر کر کے اپنا کام چلاتے تھے۔

ہر چند کہ چھاپہ تھانہ سٹی ڈویژن کے ایس۔ایچ۔او کی نگرانی میں مارا گیا تھا مگر پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے والوں میں حوالدار اکبر خان پیش پیش تھا جو سادہ لباس میں ڈیوٹی دینے اور کرائم برانچ سے تعلق رکھنے کے باعث "اسپیشل والا اکبر" کہلاتا تھا اور تھانہ سٹی ڈویژن کی حدود کے جرائم پیشہ افراد میں خوفناک شہرت رکھتا تھا۔

جب پولیس والے پہاڑی کے کونوں کھدروں سے تمام مشتبہ حُلیوں والوں کو ایک جگہ جمع کر کے نیچے لا رہے تھے تو یہی وہ شخص تھا جو اچانک قطار توڑ کر ایک طرف کو بھاگ کر گیا تھا اور اس سے پہلے کہ کوئی ایکشن لیا جاتا چھاپے کی بھگدڑ میں قدموں تلے روندے جانے والے ایک پھولدار پودے کو سیدھا کر کے دوبارہ قطار میں شامل ہو گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد اسپیشل والے اکبر خان کی نظر اُس پر گہری ہو گئی تھی۔ اس کا سابقہ ایسے متعدد جرائم پیشہ افراد سے پڑ چکا تھا جو قانون کی گرفت میں آنے کے بعد خود پر پاگل پن طاری کر لیتے تھے اور اس طرح بعض اوقات عدالت سے اپنی سزا میں تخفیف کرانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر گرفتار شدگان کی چھانٹی کوئی ایسا مشکل عمل ثابت نہیں ہوا تھا۔ اُن میں سے زیادہ تر سابقہ اخلاقی مجرم ثابت ہوئے جنہیں علاقے کے پُرانے سپاہی بخوبی جانتے تھے اور قانون کے محافظوں کا گذشتہ تجربہ اس بات کا گواہ تھا کہ اخلاقی مجرم کمینی اور سفلی طبیعتوں کے مالک ہوتے ہیں اور کمینی طبیعتوں کے لوگ ڈاکہ زنی اور قتل و غارت کی طرح کے جرائم کرنے کی ہمت کبھی نہیں کرتے کہ ان میں بہرحال ایک مخصوص قسم کی دلیری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخلاقی مجرموں کو الگ کرنے کے بعد جو لوگ گرفتار باقی بچے تھے اُن میں سے چند ایک دوسرے شہر دل کے معزز ملزم نکلے جنہوں نے ابتدائی زد و کوب میں ہی اپنے اصلی نام اور عرفیتیں اُگل دیں۔

تفتیش کے اسی مرحلے پر وہ اسپیشل والے اکبر کے سامنے پیش ہوا تھا۔ جب معمول کے مطابق اُس کا نام پوچھا گیا تو اُس نے خواب آلود لہجے میں جواب دیا:

"آفاق ـــــ"

اُس کے لہجے اور نام نے کچھ دیر کے لئے کمرے میں خاموشی طاری کر دی تھی۔

"پورا نام بتاؤ۔۔۔!" اکبر خان نے چھڑی اُس کی ناک کے بائیں نتھنے میں گھُسا کر گھُمائی تھی۔

"آفاق۔۔۔" اُس کا لہجہ پریشان کُن حد تک پُرسکون تھا۔

"عرف؟" اکبر خان نے اس مرتبہ چھڑی کو اُس کے نتھنے میں بجائے گھُمانے کے اس طرح آگے کو حرکت دی تھی جیسے وہ اُس کا نوکیلا سِرا اُس کی کھوپڑی سے باہر نکالنا چاہتا ہو۔

"آفاق!" چہرے پر اذیّت کے آثار نمایاں ہونے کے باوجود اُس کا لہجہ نہیں کپکپایا تھا۔

"تم پہاڑی پر قطار توڑ کر کیوں الگ ہوئے تھے۔۔۔؟" سی ڈویژن کے سب انسپکٹر نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے اکبر خان کی جگہ سوال کیا تھا۔

"پھولدار پودا روندا جائے تو گھروں میں بچّے رونے لگتے ہیں۔"

اُس کے جواب پر تھانے کے انچارج کے ہونٹ سکڑ گئے تھے اور اُس نے حیرت سے حوالدار اکبر کی طرف دیکھا تھا جس نے آگے بڑھ کر اُس کی داڑھی اور مونچھوں کے گھنے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں بھینچ کر اتنی سختی سے جھنجھوڑا تھا کہ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز پیدا ہوئی تھی۔

"سیل میں لے جا کر اس کا حساب کتاب دُرست کرو" اُس نے ملزم کی داڑھی کو جھٹکا دے کر اُس کا رُخ سیل کی طرف کرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا تھا۔۔۔ لیکن باوردی کانسٹیبل کے ساتھ جانے سے پہلے وہ اکبر خان کی جانب بڑھ کر اُس کی قمیض کے کالر پہ چھت سے اُکھڑ کر آ گرنے والے چُونے کو اپنی انگلیوں کی ملائم حرکت سے صاف کر گیا تھا۔ اُس کی اِس حرکت نے کچھ لمحوں کے لئے کمرے میں ایک انتہائی نوکیلی خاموشی طاری کر دی تھی۔

رات کے وقت اُسے دیگر تمام ملزموں سے الگ ایک سیل میں بند کر دیا گیا تھا اور وہاں اُس سلوک کی ابتدا کی گئی تھی جس کے باعث گوشت پوست والے انسان ناکردہ گناہوں تک کی ذمّہ داری اپنے سَر لینے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن اُس نے تمام اذیّتیں سنگریزوں سے بنے ہوئے اپنے بدن پر اتنی جی داری اور خاموشی سے برداشت کی تھیں کہ قانون نافذ کرنے والوں کا شک وشبہ

اور غصّہ بڑھتا چلا گیا تھا۔

چند دنوں بعد تنگ آ کر اسپیشل والے اکبر خان نے سپاہیوں کو وہ حربے استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی جو ایذا رسانی کے ساتھ توہین اور ذلّت کے انتہائی دردناک پہلو رکھتے ہیں۔ آخرِ کار وہ بول اٹھا تھا، لیکن جسمانی کرب کی انتہا پر پہنچ کر اُس کے مُنہ سے بے ساختہ نکلنے والے الفاظ نہ صرف یہ کہ اُس کے اعضا کی ترتیب مسخ کرنے والوں کے لئے اجنبی تھے بلکہ شاہ روشن چراغ کی پہاڑی سے اُس کے ساتھ گرفتار ہونے والوں نے بھی اُن کے بارے میں مکمل ناآشنائی کا اظہار کیا تھا۔

وہ ایسے الفاظ تھے جو ثقیل حروفِ ابجد پر مشتمل ہوتے ہیں اور جن کے معنی نہ جاننے کے باوجود سُننے والے محسوس کرتے ہیں کہ یہ لفظ بے معنی ہرگز نہیں ہو سکتے اور انہیں ایک بے معلوم سا احساس یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کا مطلب نہ سمجھنا ایک لحاظ سے اُن کے حق میں بہتر ہے، اس لئے کہ ایسے الفاظ بہر حال خُوش کُن چیزوں کے لئے استعمال نہیں ہوتے۔

جب اسپیشل والے اکبر خان کو پتہ چلا تو اُس نے خالی خالی نظروں سے سی ڈویژن کے انچارج کو دیکھتے ہوئے کہا:

"میرے خیال میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا مطلب کسی زبان میں "آندھی"، "زلزلہ" یا "سیلاب" وغیرہ ہوگا۔"

انچارج نے حوالدار اکبر خان کی بات سُن کر اُسے بہت غور سے دیکھا اور پھر ایک گہری سانس بھر کر مایوسی سے سر ہلانے لگا۔

خصوصی عقوبت خانے میں اُس کی منتقلی کے تیسرے دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس کے بعد "اسپیشل والا اکبر" آفاق کے ذکر پر ہر بار چونک جاتا تھا اور پھر کچھ دیر تک ایک عجیب سی غائب دماغی اور خالی الذہنی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ہر چند کہ اس موقع پر انچارج اور سب انسپکٹر بھی سیل میں موجود تھے اور سب کچھ ان کی نظروں کے سامنے ہوا تھا مگر اس واقعے کے بعد

اکبر خان کی از خود رفتگی اور اُس کی نظروں کا خالی پن اُن کی سمجھ سے باہر تھا۔

ہُوا یوں تھا کہ جب ایک دن اور ایک رات کے بعد کمر کے پیچھے لے جا کر چھت کے کُنڈے کے ساتھ باندھے ہوئے اُس کے بازو کھولے گئے اور وہ تھوڑی دیر سر سے پاؤں تک لرزنے کے بعد کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر ایسے آسن میں بیٹھ گیا جیسے اگلی سزا بھگتنے کے لئے ہمہ تن تیار ہو گیا ہو تو اکبر خان نے اُس سے کہا:

"تیرے ساتھ والے اپنا کھایا پیا اُگل کر ایک طرف ہو گئے ہیں۔ تُو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے۔"

یہ بات حوالدار اکبر نے اُس وقت بھی کہی تھی جب اُس نے اُسے اُلٹا لٹا کر اتنا مارا تھا کہ اُس کی کھال اُدھڑنی شروع ہو گئی تھی اور یہی بات اُس نے اُس وقت بھی دُہرائی تھی جب پیروں کے تلووں پر بید کھانے کے دوران اُس کی ناک سے اچانک خون اُبل پڑا تھا لیکن حسبِ سابق اس مرتبہ بھی وہ اس بات کا کوئی جواب دیئے بغیر سامنے بیٹھے تین پولیس والوں کو اس طرح دیکھتا رہا تھا جیسے کوئی بہت دُور کی اور دیر کی چیز پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ اچانک اپنے بازوؤں کے چٹختے ہوئے جوڑوں کو بصد مشکل سنبھالتے ہوئے اُٹھا تھا اور انچارج کے نزدیک پہنچ کر جھک گیا تھا اور اُس وقت اُن تینوں کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئی تھیں جب انہوں نے دیکھا کہ اُس نے تھانیدار کی وہ چھڑی اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ سے اُٹھا کر اُس کی کُرسی کے ساتھ دوبارہ انتہائی احتیاط کے ساتھ کھڑی کر دی تھی جو اُس کی بے دھیانی میں کسی وقت پھسل کر فرش پر جا گری تھی۔ حوالدار اکبر بہت جلد اپنی حیرت پر قابو پا کر اُس کو سر کے بالوں سے پکڑ کر دوبارہ فرش پر پٹخنے والا تھا کہ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے توقف کرنے کو کہا تھا اور اس اشارے میں پتہ نہیں کیا اسرار تھا کہ اکبر خان کے ہاتھ ہوا میں اُٹھے رہ گئے تھے۔ اس مرتبہ وہ آہستہ آہستہ سب انسپکٹر کے قدموں پر جھکا تھا اور اُس کا پاؤں ایک طرف ہٹانے کے بعد اُس نے فرش سے ایک زخمی مکڑی اُٹھائی تھی جو معلوم نہیں کب اُس نے

سب انسپکٹر کے جوتے تلے آتی دیکھ لی تھی اور پھر اُس مکڑی کو انتہائی احتیاط سے کوٹھڑی کی آہنی جالی کے ساتھ چپاں کر کے چھوڑ دیا تھا۔

"یہ تو کیا کر رہا ہے ؟" اسپیشل والا اکبر خان ایک مرتبہ پھر اُسے چیرنے پھاڑنے کی تیاری کرتے ہوئے بولا تھا۔

"مکڑی کی ہزاروں آنکھیں ہوتی ہیں ـــــ اسی لئے صحیح آدمی پہچان لیتی ہے اور نازک موقعے پر جالا بُن دیتی ہے۔ اس کی عزت کرنی چاہیئے ـــــ" اُس نے نصیحت کرنے کے انداز میں جواب دیا تھا۔

اس بے تکی بات پر حوالدار اکبر خان یکلخت اپنے اُس جلالی رُوپ میں آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ علاقے کے جرائم پیشہ افراد میں "قصائی کا بچہ" کہلاتا تھا۔ اُس نے بھاری بھرکم سپاہیوں کو اُس پر اصلی اور بڑی ترکیب استعمال کرنے کا حکم دیا تھا اور خود اُس سے یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ اُسے دوسرے دن تک اُس کے بارے میں تمام اطلاعات مل جانی چاہئیں کہ وہ شاہ روشن چراغ کی پہاڑی پر آنے سے قبل کہاں کہاں رہا تھا اور کن کن وارداتوں میں ملوث تھا اور یہ کہ اُس کا پُورا نام کیا ہے۔

دوسرے دن جب اکبر خان تھانے پہنچا تو عام توقعات کے مطابق زیرِ تفتیش ملزم کی کوٹھڑی میں جانے کے بجائے سیدھا تھانیدار کے کمرے میں چلا گیا اور تشویشناک لہجے میں بولا:

"کل میں نے سائنس کے مضمون پڑھنے والی اپنی بیٹی سے یونہی آفاق کی بات کا ذکر کیا تو اُس نے بتایا کہ واقعی مکڑی کی آنکھوں کا حساب لگانا بہت مشکل ہے ـــــ"

"مگر یہ اُس نے کیا بکواس کی تھی کہ مکڑی صحیح آدمی کو پہچان لیتی ہے اس لئے اس کی عزت کرنی چاہیئے ـــــ؟" تھانیدار نے اسپیشل والے حوالدار اکبر خان جیسے پختہ کار اور دلیر آدمی کو اتنی معمولی سی بات پر پریشان ہوتے دیکھ کر ہنستے ہوئے پوچھا ـــــ

"وہ کہہ رہی تھی کہ یہ تو ملزم نے یوں ہی آگے بات سے بات جوڑ دی ہے۔ مگر یہ کتنی

عجیب بات ہے کہ وہ جنگل میں مکڑی کی ہزاروں آنکھیں گِنتا رہا ہے ــــــ"

"ہاں ــــــ مجرم تو وہ عجیب ہے" تھانیدار کو اُس کی وہ حرکت یاد آگئی تھی جب اُس نے مار پیٹ کے دوران فرش پر گری ہوئی چھڑی اُٹھا کر دوبارہ سلیقے سے کھڑی کر دی تھی۔ اُس دن کے بعد سے اسپیشل پولیس کا حوالدار اکبر خان جس کا ملزموں کو اقبالی کرانے کا ریکارڈ سو فیصد تھا، آفاق کے ذکر پہ ہر بار چونک کر اور پھر کچھ دیر تک ایک عجیب سی غائب دماغی اور خالی الذہنی کا مظاہرہ کر کے سی ڈویژن کے انچارج کو حیرت زدہ کرنے لگا تھا اور آج جب اُس نے ملزم کے مُنہ سے اصلی اور بڑی سزا کے دوران بے معنی الفاظ کی ادائیگی کے بارے میں سُن کر اُن کا مطلب آندھی اور زلزلہ اور سیلاب وغیرہ بتایا تو تھانیدار کچھ دیر تک اُسے غور سے دیکھ کر مایوسی سے سر ہلاتا رہا اور پھر یکلخت اُس نے ملزم کو آزاد کر دینے کے بارے میں اُس کی رائے طلب کی جس پر اسپیشل والے کے چہرے سے سایہ گُذر گیا اور وہ اُس بچے کی طرح تیزی سے پلکیں جھپکانے لگا جسے اچانک دو انتہائی شدید اور اہم خواہشوں میں سے کسی ایک کو پورا کر لینے کا اختیار دے دیا جائے اور گہری سوچ اُس کی پیشانی پر وہ شکنیں ڈال دے جو اُس کے معصوم چہرے کے لئے بے حد اجنبی اور نامانوس معلوم ہوں۔ پھر اُس کی آنکھوں میں ایک بعید از فہم دُکھ نے سر اُٹھایا جو لمحہ بہ لمحہ تیز تر اور واضح ہوتا گیا اور بالآخر اُس نے کٹ کٹ کر شاخوں میں تقسیم ہوتی ہوئی آواز میں کہا:

"ہاں ــــــ ہمیں محمّد آفاق کو روکنا نہیں چاہیئے ــــــ"



When we say a thing "exists", we mean by this – existence in time. But there is no time in three — dimensional space. Time is the fourth dimension. If life is a four – dimensional body, then a three – dimensional space will be its section, its projection or its limit.

Existence in time does not embrace all the aspects of existence. Apart from existing in time, every thing that exists ——— exists also in eternity.

(P.D. OYSPYNSKY)


کجرو

دونوں مُرغوں کو لڑتے تین گھنٹے گذر چکے تھے۔

دونوں مُرغوں کو لڑتے تین گھنٹے گذر چکے تھے اور فضا پر ہولناک سکوت طاری تھا۔ دونوں حریف اب اس حالت کو پہنچ چکے تھے جب وُجود میں زندگی کے آثار آہستہ آہستہ مدہم پڑنے لگتے ہیں اور اعضا میں موت کے سائے ناتوانی کی شکل میں پھیلتے ہیں اور اعلیٰ حسب نسب والے جانوروں کو احساس ہو جاتا ہے کہ مدِ مقابل بہت سخت جان اور ضدّی نکلا اور اُن کی آخری خواہش یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خود مرنے سے پہلے اُسے بھی مرتے ہوئے دیکھ لیں۔ حملہ کرنے اور مدافعت کی تمام قوّت اور صلاحیّت خرچ کر دینے کے بعد وہ ایک دُوسرے کے سینے سے سینہ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ فقط حریف کے جُھکے ہُوئے سَر کے اُٹھنے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ دوبارہ حملہ آور ہوں لیکن اُن کی کانپتی ہوئی ٹانگوں اور بار بار بدن سے چپک جانے والے پرّوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اچھی نسل والوں نے پیٹھ دکھانے کے بجائے موت کو قبول کر لیا ہے اور اس طرح ایک مرتبہ پھر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصیل جانور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ اُن کی ناز برداری کی جائے اور اُنہیں بہترین خوراک مہیا کی جائے اور اُن کی تربیت تجربہ کار ہاتھوں سے انجام پائے۔ زمین کو اُن کے خُون کے آخری قطروں سے رنگین ہوتے دیکھ کر اُن کے مالکوں کا جی چاہتا ہے کہ کسی طرح تماشائیوں کی آنکھیں

بند ہو جائیں تاکہ وہ اپنے جانثار کو مرنے سے پہلے گود میں اٹھا سکیں اور اُسے یقین دلا سکیں کہ اس کی تکلیف سے انہیں دُکھ پہنچا ہے اور یہ کہ اُس کی دلیری انہیں زندگی بھر یاد رہے گی۔

آس پاس کے باغوں میں بہار کی پہلی نشانی آلوچوں کے سفید پھولوں کی شکل میں ظاہر ہو چکی تھی اور بکریاں پالنے والے خانہ بدوش میدانوں سے واپسی کا سفر اختیار کر چکے تھے اور ان دنوں حسبِ دستور راستے میں پڑنے والے قصبے کے نواح میں ڈیرے ڈال کر پہاڑوں پر لوٹنے سے قبل چوٹیوں کی برف پگھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

موسم کھلتے ہی شان پور کا کہر بستہ سکوت ٹوٹ گیا تھا اور گھروں کے فرش اور دیواروں پر ایک مرتبہ پھر چیونٹیوں کی قطاریں نمودار ہو گئی تھیں اور صبح دم چھتوں اور دریچوں سے گھونسلے بناتی چڑیوں کی چہچہاہٹ زندگی کی سخت جانی کا ثبوت بن کر ابھرنے لگی تھی اور ڈھولک کی تھاپ اور شادی کے گیتوں کی آوازیں راتوں کی خاموشی میں دُور دُور تک سنائی دینے لگی تھیں۔

ندی کے کنارے موسمِ بہار کے پہلے جوڑ کو شروع ہوئے تین گھنٹے گذر چکے تھے۔ لڑائی کے ابتدائی لمحوں میں بھی ایسی ہی خاموشی طاری ہوئی تھی جب خانہ بدوشوں کا "سنہرا" چھوٹتے ہی زور آوری کرتے ہوئے ریاست والوں کے "ست رنگے" کو دھکیلتا چلا گیا تھا، اور یوں محسوس ہوا تھا جیسے ست رنگے پر رقمیں لگانے والوں کے اندازے غلط تھے اور خانہ بدوشوں کے سنہری مرغے کا بھاری تن و توش چربیلا نہیں تھا۔

"قندھاری نسل ہے!"

ایک بوڑھا چیخا تھا اور شان پور والوں کا ہذیانی شور یکلخت ماند پڑ گیا تھا۔ لیکن جب دُوسرے ہوتے میں ریاستی اصیل نے اپنے گٹھے ہوئے بدن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انتہائی پھرتی سے جھپٹیاں مارنی شروع کیں تو خانہ بدوشوں کا بھاری بھرکم سنہرا چکرا کر اُلٹے قدموں زمین چھوڑتا چلا گیا تھا۔

"رامپوری خون ہے!"

وہی بوڑھا چلایا تھا اور مجمع ایک مرتبہ پھر جھومنے لگا تھا۔

انہی اچھالوں کے دوران ست رنگے نے ایک ایسی شست باندھی تھی کہ اس کے دائیں پنجے کے لوٹتے ہوئے خار پہ بندھا ہوا پیتل کا نوکیلا انگوٹھا خانہ بدوشوں کے مرغے کی بائیں آنکھ کو چھیدتا چلا گیا تھا اور بے گھروں کی ٹکڑی میں کسی نے زور سے "آ ___ ہاں!" کہہ کر اپنا سینہ کوٹا تھا۔

"کانا پرندہ آدھا وجود ہوتا ہے ___"

حکیم جی نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے ظہور کے کان میں سرگوشی کی تھی ___

"اب اسے اپنی اکیلی آنکھ سامنے رکھنی پڑے گی ___"

ظہور کے ماموں نے ایسے سینکڑوں جوڑ دیکھے تھے ___

"اسی لئے کہتے ہیں کہ اندھا ہونے سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ کانا ہونے سے بچا جائے ___"

دوسرے ماموں نے اپنے سیانے ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا ___

ظہور احمد کا اڑا ہوا رنگ اس کے چہرے پر واپس آ گیا تھا ___

پہلا پانی کرانے تک ریاست کے ست رنگے نے خانہ بدوشوں کے شاندار مرغے کا سراپا بگاڑ دیا تھا۔ اُس کی ضائع ہو جانے والی آنکھ کی جگہ پڑ جانے والے گڑھے میں بار بار خون کا ایک جیتا جاگتا قطرہ تشکیل پا کر زمین پر ٹپک جاتا تھا ___

ہنگامہ پانیوں کی بات پر ہوا تھا ___

پانی کے وقفے کے بعد دیکھنے والوں کو ایک مرتبہ پھر یوں محسوس ہوا تھا جیسے بے گھروں کا سنہرا کچھ دیر میں ست رنگے کے پرخچے اڑا دے گا۔ اس نے پانی کے بعد چھوٹتے ہی گردن اونچی کر کے ریاست کے پرندے کو کلغی کے پیچھے سے پکڑ کر اوپر تلے تین ایسی پھینٹیاں ماری

تھیں جن سے ست رنگا لڑ کھڑا گیا تھا اور مجمع پر دوسری مرتبہ خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

"صدقے!"

خانہ بدوشوں کی ٹکڑی میں سے کوئی پکارا تھا۔

"اوّل تو شان پور والوں کو ریاست کے جانور کا جوڑ اپنے کسی پالتو سے کرانا چاہیئے تھا" حکیم صاحب نے ظہور کے کان میں کہنے کی کوشش کی تھی۔"ہم نے تو نہیں سُنا کہ راجوں نے کبھی چنگڑوں اور بکریالوں سے جوڑ ڈالے ہوں۔"

"بکریاں پالنا پیغمبری پیشہ ہے۔ حکیم جی!"

ظہور کے ماموں نے حکیم صاحب کی بات سُن لی تھی۔

"بکریال بے گھرے ضرور ہوتے ہیں مگر مُردار نہیں کھاتے۔ چنگڑوں سے ان کا کیا تعلق ہے؟"

دُوسرے ماموں نے کہا تھا۔

"مگر ریاست میں پانی ایک ہوتا ہے۔ جانوروں کے گرم ہونے کے فوراً بعد۔ پھر وہ ہوتے ہیں اور کھلا میدان ہوتا ہے۔ شان پور والوں کی طرح ہم چار پانی نہیں کراتے۔ یہ زنانہ طریقہ ہے۔"

حکیم صاحب کے جواب سے ظہور سناٹے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ شان پور بہرحال اُس کی ماں کا قصبہ تھا۔

"حکیم جی! جو جانور چار پانیوں والے جوڑ کے لئے تیار کیا جائے اُس کے لئے ایک پانی کی تکلیف تو سمجھ میں آتی ہے مگر ایک پانی کے عادی کو چار پانیوں سے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟"

ظہور کے ننھیالی رشتہ داروں میں سے کوئی بولا تھا۔

"ہم خدمت گار ساتھ نہیں لائے۔"

حکیم صاحب کے لہجے کی پریشانی چھپی نہیں رہی تھی۔ دُوسرے پانی پر شان پور والوں

کے اپنے آدمی ریاست کے مُرغے کی خدمت کے لئے حاضر ہو گئے تھے۔

لیکن پانی کے دُوسرے وقفے کے بعد بھی خانہ بدوشوں کا مُرغا ریاست والوں کے "سُست رنگے" پر بھاری پڑنے لگا تھا۔

یہ کیا بات ہے حکیم جی، کہ وقفے پر بے گھروں کا پرندہ ہمارے جانور سے زیادہ تازہ دَم ہو جاتا ہے؟" ظہور حیرت سے بولا تھا

حکیم صاحب نے اپنا مُنہ ظہور کے کان کے نزدیک لا کر سرگوشی کی تھی "خانہ بدوش اپنے ساتھ مُرغی بھی لے کر آئے ہیں اور وقفے پر اپنے مُرغے کو آرام دینے کے بجائے اُسے مُرغی کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سے ان کے جانور کی طبیعت کھلتی ہے اور وہ پھر جان پکڑ جاتا ہے۔"

"لیکن ہم تو کبھی ایسا نہیں کرتے"

"یہ صرف ان زناکاروں کا طریقہ ہے" حکیم صاحب بُڑبڑائے تھے۔

لیکن ریاست کے اصیل پرندے نے اپنے سے کہیں زیادہ بھاری حریف کے حملے جی داری سے برداشت کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اُسے واپس رگیدنا شروع کر دیا تھا۔ اس دوران اُس کا سینہ چھلنی ہو گیا تھا اور اب دیکھنے والوں کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ زمین پر گرنے والا خون خانہ بدوشوں کے "سُنہرے" کی پھُوٹ بہنے والی آنکھ سے ٹپکا ہے یا "سُست رنگے" کے سینے اور گردن کی کٹی ہُوئی شریانوں سے اُبل پڑا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مرحلہ آ گیا تھا جب دونوں جاندار ایک دُوسرے کے لہو لہان وجُودوں سے یوں لپٹ گئے تھے جیسے اپنا بوجھ اپنے حریف کی ٹانگوں پر ڈالنا چاہتے ہوں۔

تیسرے پانی پر حکیم صاحب نے گُڑ اور باداموں اور منقا کا مرکب تیار کر کے "سُست رنگے" کی چونچ کے اندر دھکیل دیا تھا اور شان پُور کے خدمت گاروں سے اُس کی ٹانگیں اپنی ہدایات کے مطابق دبوائی تھیں اور جب گرم پھُونکیں مارنے کی باری آئی تو انہوں نے ظہور کو ہٹا کر خُود

اپنا مُنہ اُس کی پیٹھ سے جوڑ دیا تھا۔ اسی دوران موقع پاکر جب ظہور خانہ بدوشوں کی ٹولی کی طرف گیا تو اُس کی فحش گالی اس کے تمام ننھیالی بزرگوں نے سُنی تھی۔

خانہ بدوشوں کا مُرغا سر سے پاؤں تک خون میں لتھڑا ہُوا ہونے کے باوجود ایک چھوٹی عُمر کی سفید مُرغی سے کھیل رہا تھا اور اٹھکیلیوں کے دوران مُرغی کے سفید چمکدار پروں پر اُس کے خون کی دھاریاں عجیب طرح کے نقش و نگار بنا رہی تھیں۔

شان پور والوں کی خشک برساتی ندی میں بہار کے پہلے جوڑ کا دردناک حصّہ پانی کے تیسرے وقفے کے بعد شروع ہُوا تھا جب بے گھروں کا "سُنہرا" حسبِ سابق چھُوٹتے ہی اپنے حریف کو مُستقل بھینٹیاں مارتا ہُوا دائرے کے وسط سے اس جگہ تک دھکیلتا چلا گیا تھا جہاں شان پور کے گھبرو بھڑکدار کپڑے پہنے سگریٹ کی پھٹی ہُوئی ڈبیوں کو اُلٹ کر اپنے گھٹنوں پر رکھّے شرطوں کا حساب لگا رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے اور وقفے وقفے سے اپنے رقم لگے مُرغے کو باآوازِ بلند داؤ پیچ بتا رہے تھے۔ ریاست والوں کے پرندے کا پانی کے وقفے کے فوراً بعد کمزور پڑ کر پیچھے ہٹتے چلے جانا وہ پہلے بھی دیکھ چکے تھے مگر اس دفعہ وہ اپنی چھوڑی ہُوئی زمین کو واپس حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا تھا اور تمام جوابی اُچھالوں میں اپنے حریف سے ہوا میں ٹکرانے کے بعد کچھ اور پیچھے کی طرف پلٹ کر گرا تھا اور آخرِکار جب اس نے سانس دُرست کرنے کے لئے اپنی چونچ مدِمقابل کے سینے میں چھپانے کی کوشش کی تو مجمع پر ہولناک سکُوت طاری ہو گیا تھا۔

اگر ریاست کے جانور نے مقابلے کے ابتدائی لمحوں ہی میں اپنے حریف کی آنکھ نہ ضائع کر دی ہوتی تو شان پور والے کبھی اس پر بڑی رقمیں لگانے کی غلطی نہ کرتے۔

اس موقع پر ظہور نے مقابلے کو دوبارہ بیچ میدان میں لے جانے کے بہانے چیل کی طرح جھپٹ کر اپنا مُرغا اُٹھا لیا تھا اور اس دوران مُرغے کا مُنہ اپنے مُنہ میں ڈال کر اس کی آنکھوں اور چونچ میں جم جانے والے خون کو چوس کر صاف کرنے کی کوشش کی تھی جس پر

خانہ بدوشوں کی ٹولی سے دھیمی سی صدائے احتجاج بُلند ہُوئی تھی۔

"پانی سے پہلے پرندے کو ہاتھ لگانا نہیں بنتا!"

اگر یہ بات خانہ بدوشوں میں سے کسی نے کہی ہوتی تو ظہُور اس کا سَر پھاڑ دیتا مگر اعتراض کرنے والا اس کا بڑا ماموں تھا جو اصُولوں کی اتنی کھُلی خلاف ورزی پر شرما گیا تھا ـــــ یہ بات بچّوں تک کے علم میں تھی کہ سوائے اس صُورت میں کہ پرندے کی چونچ میں حریف کے بدن کا کوئی پَر پھنس جائے لڑائی کے دوران اسے بازوُں میں اُٹھا لینا تو در کنار ہاتھ سے تھپتھپانا بھی منع تھا۔

"میں چوتھا پانی کرا رہا ہُوں" ظہُور نے انتہائی خجالت سے جواب دیا تھا۔

ہجوُم پر چھانے والا سکوُت مزید ہولناک ہو گیا تھا ـــــ ریاست والوں نے پہلے چار پانیوں کے قانوُن پر اعتراض کیا تھا اور اب خوُد چوتھے پانی کے لئے مقابلہ رُکوا بیٹھے تھے۔

آخری وقفے کے دوران سوائے ان لمحوں کے جب حکیم صاحب نے مُرغے کو کُشتہ کھلایا تھا بقیہ تمام وقت ظہُور خوُد اپنے "ست رنگے" کے ساتھ لپٹا رہا تھا۔ اس نے سوئی دھاگے کے ساتھ اس کے سینے اور کلغی کے زخموں کو ٹانکے لگائے تھے اور اپنے مُنہ میں چبائے ہوئے کھوپرے کے ریزے زبان پر رکھ کر اس کا تمام بدن چاٹا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی دُم اُٹھا کر مُنہ سے ٹھنڈے پانی کی پچکاریاں مارنے کا کام بھی اس نے خوُد انجام دیا تھا اور ان تمام کاموں کے دوران وہ اس سے ہمدردی کی باتیں کرتا رہا تھا اور اپنی آنکھوں میں بار بار جمع ہو جانے والے آنسوؤں کو سَر کے جھٹکے سے دائیں بائیں گراتا رہا تھا۔ ان تمام کاموں کے بعد بچ جانے والے وقت میں اُس نے اپنے پالتو کو چادر میں لپیٹ کر بازوؤں میں اٹھا لیا تھا اور اُسے گرم سانس کی پھُونکیں مارنے کے ساتھ ساتھ ہلکورے دیتا رہا تھا۔

جب حتمی مقابلے کے لئے ظہور نے اپنا پرندہ میدان میں اُتارا تو وہ سر سے پاؤں تک لعابِ دہن کے ساتھ چپکائے ہوئے کھوپرے کے سفید ٹکڑوں سے اٹا ہُوا تھا جب کہ

خانہ بدوشوں کا "سنہرا" اسی طرح لہو میں لتھڑا ہوا واپس آیا تھا۔

" زناکاروں نے اسے اس دفعہ بھی صرف مرغی کے ساتھ چھوڑے رکھا ہے۔" حکیم صاحب پھر بڑبڑائے تھے۔

آخری پانی کے بعد بھی ابتدائی چند لمحوں میں خانہ بدوشوں کے قندھاری حسب نسب والے اصیل نے اپنے بھاری تن و توش سے ایک مرتبہ پھر فائدہ اٹھایا تھا مگر اس مرتبہ اس کی کامیابی اتنی بھرپور ثابت نہیں ہوئی تھی اس لئے کہ ریاست والوں کا "ست رنگا" پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونے کے بعد انتہائی پھرتی سے جھکائی دے کر "سنہرے" کے حاوی ہوتے ہوئے پروں کے نیچے سے باہر نکل آیا تھا اور اس کے بعد اُس نے میدانی علاقوں کی لڑاکا نسلوں کی مخصوص پھرتی سے کام لیتے ہوئے مسلسل کئی ایسے پینترے دکھائے تھے جس سے اس کے حریف کا سر چکرا گیا تھا اور ٹانگیں لرزنے لگی تھیں۔ سب جانتے تھے کہ وہ مقابلہ جو "سنہرے" کی طاقت اور "ست رنگے" کی پھرتی کے درمیان شروع ہوا تھا اب فقط بہتر سانس کا مسئلہ ہو کر رہ گیا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ کون زیادہ دیر اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہتا ہے۔ شرط یہ تھی کہ کس کا دم دیر سے ٹوٹے گا۔

دونوں مرغوں کو لڑتے تین گھنٹے گذر چکے تھے اور فضا پہ ہولناک سکوت طاری تھا۔ دونوں حریف اب اس حالت کو پہنچ چکے تھے جب وجود میں زندگی کے آثار آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگتے ہیں اور اعضا میں موت کے سائے ناتوانی کی شکل میں پھیلتے ہیں اور اعلےٰ حسب نسب والے جانوروں کو احساس ہو جاتا ہے کہ مدِ مقابل بہت سخت جان اور ضدی نکلا اور اُن کی آخری خواہش یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خود مرنے سے پہلے اُسے بھی مرتے ہوئے دیکھ لیں۔

آخرِ کار جب حملہ کرنے اور مدافعت کی تمام قوت اور صلاحیت خرچ کر دینے کے بعد دونوں مُرغے ایک دوسرے کے سینے سے سینہ جوڑ کر بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے تو شان پور والوں کے چہروں پر آنے والے لمحوں کا خوف سائے سے ڈال گیا جبکہ خانہ بدوشوں کی ٹولی میں پہلی مرتبہ زندگی

کی ہلچل نمودار ہوئی۔

دونوں ٹولیوں کی بڑی اور بھلی توقعات کے عین مطابق لڑائی کے اس مرحلے میں "سنہرے" نے جلد ہی اپنی طویل القامتی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بغیر حرکت کئے اپنی چونچ کے نیچے کھڑے "ست رنگے" کی کلغی اور گردن نوچنا شروع کردی تھی۔ جب ریاست کا نسلی پرندہ اپنی جان توڑ کوشش کے باوجود جوابی حملے کے لئے جست لگانے سے معذور رہا تو وہ خانہ بدوش بوڑھا جو کسی والئی خزاں رسیدہ درخت کی طرح جگہ جگہ سے گنجا کھچا اور اکھڑا ہوا تھا اور مقابلے کی ابتدا میں "سنہرے" کی آنکھ ضائع ہونے پر اپنا سینہ کوٹ کر ناتوانی اور صدمے سے زمین پر بیٹھ گیا تھا بے اختیار اپنی ٹیڑھی ٹانگوں پر اچھل کھڑا ہوا اور چیخا ——— "جی اوشیرا ———"

بوڑھے کے ہذیانی نعرے نے ایک لمحے کے لئے ظہور کی نظریں میدان کے وسط سے اکھاڑ دیں اور پھر اس کی آنکھیں انتہائی تیزی سے پھیلنے کے بعد سکڑ گئیں اور بوڑھے کی دائیں بغل پر مرکوز ہو کر رہ گئیں جس میں اس نے خوبصورت سفید پروں والی نرم و نازک مرغی داب رکھی تھی۔

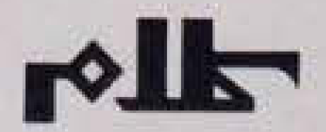
مرغی کے پروں پر "سنہرے" کے خون سے بنے نقوش بدستور موجود تھے اور وہ بار بار پلکیں جھپکا کر اپنے ساتھی کو حریف پر حاوی ہوتے دیکھ رہی تھی۔

ظہور کی پہلی چیخ آس پاس کے ٹیلوں پر سینہ پھلا کر کھڑے اپنی باری کا انتظار کرتے اصیل مرغوں کی فصیلی بانگوں تلے دب سی گئی تھی اور صرف حکیم صاحب کے کانوں تک رسائی حاصل کر سکی تھی مگر دوسری مرتبہ وہ میدان کے وسط میں پہنچ کر اپنے مرغے کو اٹھاتے ہوئے چیختا تھا ——— "ٹھیک ہے ——— بڑے ماماجی ——— ٹھیک ہے ———" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے خون میں ڈوبے "ست رنگے" کو بازوؤں میں تھام لیا تھا۔

شام ڈھلے جب ظہور کی جیپ حویلی کے صحن میں داخل ہوئی تو اس کی نئی نویلی دلہن اس کے بگڑے ہوئے تیوروں سے سب کچھ سمجھ کر سہم گئی اور اپنے دوپٹے کی اوٹ سے اسے

حکیم صاحب سے علاج مُعالجے کے سلسلے میں مشورے لیتے دیکھتی رہی۔ حکیم صاحب کو رُخصت کرکے وہ اپنا نیم مُردہ مُرغا اُٹھائے ہتھیاروں والے کمرے میں چلا گیا اور وہیں سے چیخ چیخ کر نوکروں کو مختلف مرہموں اور معجونوں کے لئے اِدھر اُدھر دوڑاتا رہا۔ رات گئے وہ ہتھیاروں والے کمرے سے نکلا اور کپڑے بدلے بغیر بستر پر لیٹ کر خاموشی سے سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا رہا۔ آدھی رات کو اُس نے دفعتہً ساتھ لیٹی دُلہن کا کمبل کھینچ کر فرش پر پھینک دیا اور اُس کے لمبے بالوں کو مُٹھی میں لپیٹ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کرکے اُسے خواب گاہ کے مدھم روشنی والے بلب کے نیچے تک گھسیٹتا ہُوا لے گیا۔ چند لمحوں تک وہ نیم تاریکی میں اپنی کانپتی ہوئی بیوی کا خوبصورت چہرہ غور سے دیکھتا رہا اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا ــــ "اس وقت تُو ہتھیاروں والے کمرے میں جا کر اُس کے ساتھ بیٹھ ــــ صبح دُوسرا انتظام ہوجائے گا ــــ"





"میرا کہنا یہ ہے کہ سات ستاروں کا جھرمٹ جو ازل سے ایک ہی شکل اور ترتیب قائم رکھے ہُوئے اس طرح گردش کر رہا ہے کہ اس کا ایک حصّہ ہمیشہ شمالی ستارے کی نشاندہی کرتا ہے، ہماری نظر میں رہنا چاہیئے، جبکہ تاریخ بتاتی ہے کہ شمالی ستارے کو ضرورت سے زیادہ اہمیّت دی گئی اور اسی کو مطمع نظر بنایا گیا اور اس طرح سات ستاروں سے زیادتی برتی گئی اور ان سے غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا۔ اس لئے کہ شمالی ستارہ اہمیّت کا حامل ہونے کے باوجود انسان کی حیرت کو بیدار نہیں کرتا جو روحانی ارتقا کا لازمہ ہوتی ہے اور وہ اپنی شناخت کے لئے سات ستاروں کی ازلی ترتیب کا مرہُون منت ہے جو پیہم حرکت کے باوجود اپنی تشکیل اور توازن برقرار رکھتے ہیں اور ایسا کرنا ایک جگہ قائم رہنے سے کہیں زیادہ دُشوار اور حیران کن ہے۔"

"اور میرا کہنا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے جو مکانوں میں ہمارے ساتھ رہائش رکھتے ہیں زیادہ سبق آموز ہوتے ہیں اور ہماری توجہ کے زیادہ مستحق ہیں مگر انسانوں کو ابتدا سے سرکش اور قوی الجثہ جانوروں اور ضرر رساں حشرات الارض نے مسحُور کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ بڑی جسامت کے مالک اور ایذا پہنچانے والے ہمارے لئے ہمیشہ زیادہ جاذب نظر ثابت ہُوئے۔ اس طرح گھریلو جانداروں کی سبق آموز اور پرُسکون اور منظّم زندگیاں ہماری نگاہوں سے اوجھل رہیں ــــ قامت میں کم ہونے اور معمول میں شامل ہوجانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ چیونٹیوں

اور مچھروں اور مکھیوں کو ناچیز گردانا جائے، کیونکہ منطق کے اعتبار سے کوئی وجود جو کائنات میں ذرا سی بھی اور کسی بھی طرح کی جگہ گھیرتا ہے لاشے اور ناچیز نہیں ہو سکتا ــــــ اور پھر اُس معیار کے مطابق جس پر انسان خود اپنی ایجادات پرکھتا ہے ایک نازک اور نہ ہونے کے برابر جسامت رکھنے والی چیز میں مکمّل نظام کا موجود ہونا زیادہ بڑی نشانی ہے ــــــ"

"اور میرا کہنا یہ ہے کہ وجود کی سرحدوں تک پہنچنے والوں نے واپسی پر مایوس کن باتیں کیں اور آفاق کو لامحدود بتلانے کے باوجود اسے قفس قرار دیا اور انسان کو مجبور اور محکوم ٹھہرایا، جبکہ قفس بذاتِ خود حدود کے تعیّن کا دوسرا نام ہے اور جو لامحدود ہو قفس کی مثال نہیں ہوتا ــــــ اور پھر یہ کہ جن پر منکشف ہُوا کہ وہ کسی صورت پابند اور جواب دہ نہیں ہیں انہوں نے اپنے آزاد اور بری الذمہ ہونے کا اظہار عامیانہ انداز میں کیا اور اختیار حاصل ہونے پر بچّوں کی طرح خوش ہو گئے اور بھول گئے کہ آخری تجزیے میں ہر بات اور ہر عمل لاحاصل ثابت ہوتا ہے ــــــ"

"اور میرا کہنا یہ ہے کہ ہمیں آنے والے اُن سرد اور منجمد لمحات کی پیش بندی کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، جب زمین پر آتش فشاں ناپید ہو جائیں گے اور بستیوں میں نوحہ گروں کے وجود کا کوئی جواز نہیں رہے گا ــــــ"

"اور میرا کہنا یہ ہے کہ اگر کسی سوال کا جواب نہ پایا جاتا ہو تو اس کی ذمّہ داری سوال کرنے والے پر عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی اس سبب سے سوال ناحق ثابت ہوتا ہے ــــــ"

"میں آپ کے خیالات سے اتفاق کرتا ہوں" ڈاکٹر نے مشورے کا وقت پُورا ہو جانے کے خیال سے گھڑی دیکھی اور خوش اخلاقی سے کہا، "آپ فی الحال نیوروسرجن کی تجویز کردہ دوا استعمال کرتے رہیں اور ایک ہفتے بعد شام کو پرائیویٹ پریکٹس کے اوقات میں میری ریذیڈنس پر تشریف لائیں ــــــ ایڈریس، کارڈ پر درج ہے ــــــ"

اس کی روانگی اور دوسرے مریض کی آمد سے پہلے ذہنی امراض کے ماہر نے اپنی اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر سے اس کی کیس ہسٹری ڈسکس کرنے کے بعد کہا، "میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہر چند

اس کی روانگی کے بعد کمرے میں داخل ہونے والا شخص اُن کا ایک پُرانا مریض تھا جو بارہویں امام کے نام چٹھیاں لکھ لکھ کر کنوؤں اور تالابوں میں پھینک دیتا تھا اور پھر بذریعۂ ڈاک ان کے جواب کا انتظار کرتا تھا ــــ اُس کی حالت پچھلے چند ہفتوں سے مزید ابتر ہو رہی تھی کیونکہ اُس پر اچانک انکشاف ہُوا تھا کہ کنوؤں اور تالابوں کے ذریعے حاضر امام کو پیغام بھیجنے کی کوشش اس کی حماقت تھی اور اب اُس کا ارادہ دریاؤں اور ندیوں کے بہتے ہوئے پانی کی طرف رجُوع کرنے کا تھا ــــ

اسے ہسپتال میں داخل کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے اپنی آخری مریضہ کو دیکھا جو ایک بڑے صنعت کار کی بیوی تھی اور ماضی میں شہر کی مشہُور سماجی کارکُن رہ چکی تھی ــ اس کی نفاست پسندی اور شائستگی اور نازک مزاجی کے حیرت انگیز واقعات اب تک ایک مخصُوص حلقے میں دُہرائے جاتے تھے ــــ گذشتہ چند دنوں سے اُسے خیال آ رہا تھا کہ چاند پر اتنے دن گذارنے کے دوران خلا نورد لازمی طور پر اپنے جسم کی گندگی وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اور اُن کی اس غلیظ اور نجس حرکت نے اُسے شدید اضطراب میں مُبتلا کر دیا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ خلائی اداروں سے اس بات کی جواب طلبی کی جائے اور انہیں اس ناپاک عمل کا احساس دلایا جائے تاکہ وہ اس کا کوئی فوری حل تلاش کریں ــــ

ڈاکٹر ہمدانی نے اس کی شکایت انتہائی انہماک اور سنجیدگی سے سُنی اور پھر اپنے مخصُوص پیشہ ورانہ خلوص اور وقار کے ساتھ اُسے یقین دلایا کہ خلا نوردوں کی خوراک روزمرّہ کے کھانے کی چیزوں پر مشتمل نہیں تھی اور وہ اس بات کا معقول انتظام کر کے روانہ ہُوئے تھے کہ انہیں اپنے سفر میں ایسی کوئی حاجت پیش نہ آئے ــــ

ہفتہ گذشتہ پر پرائیویٹ پریکٹس کے اوقات میں آنے والا وہ آخری مریض تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہُوا تو ڈاکٹر ہمدانی کی رہائش کے نزدیک واقع مسجد سے عشا کی اذان کی آواز بلند ہُوئی تھی اور اُن تینوں نے اس خیال سے خاموشی اختیار کر لی تھی کہ ممکن ہے

اس کی روانگی کے بعد کمرے میں داخل ہونے والا شخص اُن کا ایک پُرانا مریض تھا جو بارھویں امام کے نام چٹھیاں لکھ لکھ کر کنوؤں اور تالابوں میں پھینک دیتا تھا اور پھر بذریعۂ ڈاک ان کے جواب کا انتظار کرتا تھا ــــ اُس کی حالت پچھلے چند ہفتوں سے مزید ابتر ہو رہی تھی کیونکہ اُس پر اچانک انکشاف ہُوا تھا کہ کنوؤں اور تالابوں کے ذریعے حاضر امام کو پیغام بھیجنے کی کوشش اس کی حماقت تھی اور اب اُس کا ارادہ دریائے اور ندیوں کے بہتے ہوئے پانی کی طرف رجُوع کرنے کا تھا ــــ

اسے ہسپتال میں داخل کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے اپنی آخری مریضہ کو دیکھا جو ایک بڑے صنعت کار کی بیوی تھی اور ماضی میں شہر کی مشہور سماجی کارکُن رہ چکی تھی ــ اس کی نفاست پسندی اور شائستگی اور نازک مزاجی کے حیرت انگیز واقعات اب تک ایک مخصُوص حلقے میں دُہرائے جاتے تھے ــــ گذشتہ چند دنوں سے اُسے خیال آرہا تھا کہ چاند پر اتنے دن گذارنے کے دوران خلانورد لازمی طور پر اپنے جسم کی گندگی وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اور اُن کی اس غلیظ اور نجس حرکت نے اُسے شدید اضطراب میں مُبتلا کر دیا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ خلائی اداروں سے اس بات کی جواب طلبی کی جائے اور انہیں اس ناپاک عمل کا احساس دلایا جائے تاکہ وہ اِس کا کوئی فوری حل تلاش کریں ــــ

ڈاکٹر ہمدانی نے اس کی شکایت انتہائی انہماک اور سنجیدگی سے سُنی اور پھر اپنے مخصُوص پیشہ ورانہ خلوص اور وقار کے ساتھ اُسے یقین دلایا کہ خلانوردوں کی خوراک روزمرّہ کے کھانے کی چیزوں پر مشتمل نہیں تھی اور وہ اس بات کا معقول انتظام کر کے روانہ ہُوئے تھے کہ انہیں اپنے سفر میں ایسی کوئی حاجت پیش نہ آئے ــــ

ہفتہ گذرتے پر پرائیویٹ پریکٹس کے اوقات میں آنے والا وہ آخری مریض تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہُوا تو ڈاکٹر ہمدانی کی رہائش کے نزدیک واقع مسجد سے عشا کی اذان کی آواز بلند ہُوئی تھی اور اُن تینوں نے اس خیال سے خاموشی اختیار کر لی تھی کہ مُمکن ہے

دُوسرے دونوں اذہان کے احترام میں خاموش ہونا پسند کرتے ہوں ـــــ وہ اس مضحکہ خیز صُورتِ حال کو محسوس کر کے بہت با معنی اور چُبھتے ہُوئے انداز میں مُسکرایا تھا جس سے ڈاکٹر ہمدانی نے اندازہ لگایا تھا کہ مریض کے حواس حد سے زیادہ تیز ہیں اور شاید علاج کے دوران اس کے حواس کو خوابیدہ اور کُند کرنے کی ضرورت پیش آئے ـــــ

آج اُس نے آسمانی نیلے رنگ کی نہایت نفاست سے سِلی ہُوئی ہلکی ڈریس جیکٹ پہن رکھی تھی جس کی جیبوں کے کنارے اور آستینوں کے آخری حصّے سفید تھے اور اُس کی سفید جینز کے ساتھ بہت خوبصورتی سے میچ کرتے تھے ـــــ اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی کہ اگر دیکھنے والے کی نظر میز پر پڑے اس کے انوکھی وضع کے پائپ اور عام ڈگر سے ہٹے ہُوئے تمباکُو کے چوکور ڈبے اور چمڑے کے غلاف میں لپٹے گیس لائیٹر پر نہ پڑتی تو وہ اُسے کوئی اعلیٰ سَرکاری افسر کے بجائے ایسا کھلاڑی سمجھتا جو نوجوان لڑکیوں میں بہت مقبُول ہوتا ہے ـــــ

اس نے انہیں بتایا کہ اس کے سر درد میں بحالی کی صورت پیدا ہو چکی تھی لیکن وہ سول سروس سے بہرحال الگ ہونے کا ارادہ کر چکا تھا کیونکہ سرکاری نوکری اُس کے اُصُولوں اور زندگی کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر کے منافی تھی ـــــ

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے محکمے کے سربراہ نے اس کی سالانہ رپورٹ میں کیا لکھّا تھا اور نہ ہی اُسے اس بات کا علم تھا کہ نیُورو سرجن نے اس کی وزارت کے سیکرٹری کے کہنے پر ہی اسے سائیکیٹرسٹ سے رجُوع کرنے کو کہا تھا ـــــ

ڈاکٹر ہمدانی نے اُسے مزید گُفتگو پر آمادہ نہ پا کر سائیکیٹری کا سُنہرا اصُول برتا اور محض اس کی خاموشی توڑنے کے لئے کہا، "پہلی ملاقات میں آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس سے میں اور مِس نروانہ بہت متأثر ہُوئے تھے ـــــ"

اس بات پر کمرے کے کونے میں کسی عام گھریلو لڑکی کی طرح الیکٹرک کیتل کی مدد سے کوفی تیار کرتے ہُوئے ڈاکٹر نروانہ چونک پڑی تھی کہ آخر اس کے پرفیسر کو یہ علم کیونکر ہوا تھا کہ اس

نے دل آویز چہرے اور پُرکشش آنکھوں والے اس مریض کی باتوں میں واقعی ایک عجیب طرح کا سحر محسوس کیا تھا ــــ وہ شام کو پروفیسر ہمدانی کی پرائیویٹ پریکٹس کے اوقات میں آئی ہی اس لئے تھی کہ آج اُس کی آمد متوقع تھی ــــ

"نروانہ ــــ؟؟ کسی لڑکی کا معنوی اور صوتی اعتبار سے اتنا خوبصورت نام میں نے پہلی مرتبہ سُنا ہے ــــ" وہ بے اختیار بولنے لگا تھا اور دماغی امراض کا ماہر حسبِ معمول ہمہ تن گوش ہوگیا تھا ــــ "سنسکرت زبان کے لفظ "نروان" کا انگریزی تلفّظ "نروانہ" ہوتا ہے جس کا لُغوی مفہوم "آزادی" اور "نجات" ہے اور اصطلاحی طور پر یہ ایک ایسی ذہنی حالت کا نام ہے جس میں انسان کو کسی طرح کا غم اور کسی طرح کی خوشی محسوس نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ بتدریج بلند ہوتا ہُوا اس مقام تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جہاں پہنچ کر اُسے پتہ چل جاتا ہے کہ اس کا موجود ہونا ایک واقعہ ہے، اور حادثہ ہے، اور سانحہ ہے اور یہ کہ اُس کی لمحاتی موجودگی بہر حال ابدی ناموجودگی کی جانب رواں دواں ہے اور اس بات سے آگاہ ہونا اُس پر سرشاری کی کیفیت طاری کر دیتا ہے اور سرشاری کی حالت میں سُکھ اور دُکھ اور غصّہ اور خوف اور اس طرح کے تمام ناپختہ اور خام اور بچکانہ جذبات فنا ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے مہاتما بُدھ کو کبھی خوف زدہ یا غصّے کی حالت میں نہیں دیکھا گیا۔ انہیں کائنات کی کسی چیز سے شکایت نہیں رہی تھی ــــ وہ ہنسنا ترک کر چکے تھے اور اُن کو زندگی بھر رونے کا کوئی جواز نہیں نظر آیا۔"

ڈاکٹر نروانہ کو اپنے مرحوم باپ کے بعد یہ پہلا شخص ملا تھا جو اس کے نام کے معنی اور تاریخی پس منظر سے اتنی گہری آشنائی رکھتا تھا ــــ

"ایک بات بتایئے ــــ" اُس نے پائپ سُلگاتے ہوئے ڈاکٹر ہمدانی سے براہِ راست سوال کیا، ــــ "اگر مہاتما بُدھ کی ملاقات اپنے زمانے کے کسی ماہرِ نفسیات سے ہوتی تو کیا وہ نفسیات دان کائنات سے مہاتما کی کنارہ کشی کا سبب دریافت کرنے کے لئے ان کے نفس کو تحلیل کرنے کی کوشش نہ کرتا ــــ؟؟ اور کیا وہ اُن کی شخصیت میں "شیزو فرینیا" یا "پیرانوئیا"

کے اثرات کا مطالعہ کر کے اُن کی اس آگ کو بُجھانے کی تدبیریں نہ کرتا جو بعد میں ایشیا کی روشنی کہلائی ــــــ؟؟"

اس نے بات ختم کر کے اتنی بے نیازی اور اطمینان سے پائپ اپنے ہونٹوں سے لگایا جیسے اُسے یقین تھا کہ ڈاکٹر اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکے گا ــــــ

سارا کمرہ اس کے تمباکو کے خوشبودار دُھوئیں سے بھر گیا تھا اور نزدانہ کو خیال آیا کہ درُود و سلام کی محفلوں میں "اگر بتیاں" سُلگانے کے بجائے اگر کسی پائپ پینے والے نوجوان کو شرکت کی اجازت دے دی جائے تو ماحول زیادہ خوشگوار ہو جائے ــــــ

"اور پھر بات یہیں تک محدُود نہیں رہتی ہمدانی صاحب! ــــــ جون آف آرک کو اپنے بطون سے سُنائی دینے والی آوازوں کے بارے میں آپ کا علم کیا کہتا ہے ــــــ؟ اور ظاہر ہے پھر بات مزید آگے بڑھے گی اور کانوں میں گھنٹیاں بجنا اور تشنج کی کیفیت طاری ہونے کا مسئلہ زیر بحث آئے گا ــــــ آپ لوگوں کے نزدیک تو میرے خیال میں یُونانیوں کی اصطلاح "مقدّس پاگل پن" میں لفظ "مقدّس" کا کوئی جواز نہیں ہے ــــــ"

نزدانہ نے دیکھا کہ پروفیسر ہمدانی جو انتہائی پروفیشنل ہونے کے باوجُود پانچ وقت کی نماز ادا کرتے تھے اچانک اپنے خول سے باہر نکل آئے تھے اور خفیف لگ رہے تھے ــــــ

اس نے اُن کے چہرے سے گذرتے ہوئے سائے کو محسوس کیا اور یکلخت اپنے لہجے کو تبدیل کرتے ہوئے ایک دوستانہ تبسّم کے ساتھ بولا، ــــــ "میں یہ سب کچھ آپ سے ایسے پُوچھ رہا ہُوں جیسے آپ کا نام "ہمدانی" لفظ "ہمہ دانی" کی تخفیف ہو، جس کا مطلب ہوتا ہے ــــــ "ہر بات کا علم رکھنا ــــــ"

باقاعدہ مُلاقات کا وقت ختم ہوتے ہی اُس نے رُخصت ہونے کا ارادہ ظاہر کیا اور کوفی کے آخری گھونٹ لیتے ہوئے نزدانہ کو مخاطب کر کے کہا، ــــــ "جدید نفسیات اور سائیکیٹری دراصل عیسائیت کے اس ادارے کی ترقی یافتہ شکل ہے جہاں کوئی بھی شخص سزا کے خوف سے بے نیاز

ہو کر راہب کے سامنے "اعترافات" کر سکتا ہے ۔۔ لیکن ! ۔۔" اس نے کوفی کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے اپنے مخصوص تبسّم کے ساتھ بات مکمّل کی ۔۔۔ "اعترافات سُننے کا رُتبہ کسی عورت کو حاصل نہیں ہو سکتا ۔۔۔ یہ کلیسا کا قانُون ہے ۔۔۔"

اُس نے جانے سے پہلے اپنا تمباکو کا ڈبّہ اور پائپ اور کار کی چابیاں سنبھالتے ہُوئے نزوانہ کو اس کے گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی تھی جو اُس نے یوں قبول کر لی تھی جیسے انکار کی کوئی وجہ نہ رہی ہو ۔۔۔

اُن دونوں کی روانگی کے بعد ڈاکٹر ہمدانی کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلتے رہے اور پھر اپنا مقالہ ٹائپ کرتے بیٹھ گئے جس میں خواتین ڈاکٹرز کے لئے "زچگی" اور بچّوں کی بیماریوں میں اسپیشلائز کرنے کی اہمیت کا بیان تھا ۔۔۔




معذور

"آج یہاں بہت بھیڑ ہے ۔۔۔" کوڑھی فقیر نے شب بسری کی جگہ پہنچ کر اپنے بردا شتیئے سے کہا ۔۔۔

"ہاں ۔۔۔ کچھ زیادہ ہی ہے ۔۔۔" برداشتیئے نے کوڑھی کی ریڑھی اشتہاری بورڈ کے نیچے روکتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا۔

جتنی دیر برداشتیا دن بھر کی کمائی نکال کر مختلف مالیت کے سکوں کے الگ الگ ڈھیر بناتا رہا کوڑھی لمحہ بہ لمحہ کاروں کے بڑھتے ہوئے ہجوم کو حیرت سے دیکھتا اور اپنے مسخ شدہ چہرے کو ٹنڈ منڈ ہاتھوں سے سہلاتا رہا۔

"اتنی زیادہ بھیڑ ؟ ۔۔۔ کیا وجہ ہے ؟" کوڑھی سڑک کے کنارے کھڑی گاڑیوں کی بے تحاشا لمبی ہوتی قطار سے گھبرا کر ایک بار پھر بول اٹھا۔

"ہو گی بھیڑ ۔۔۔ ہمیں کیا ۔۔۔ تو میرا حساب نہ گڑبڑ کر ۔۔۔" برداشتیئے نے جھنجھلا کر جواب دیا اور پھر سے نوٹ اور سکے گننے لگا۔

انہوں نے گذشتہ چند ہفتوں سے رین بسیرے کی خاطر ڈسکوتھیک کی بلڈنگ کے موڑ پر واقع یہ نیون سائن بورڈ منتخب کر لیا تھا اور سورج ڈوبتے ہی وہ اپنا دھندا ختم کر کے سیدھے یہیں چلے آتے تھے۔

ڈسکوٹیک ایک فور سٹار ہوٹل کی انیکسی میں واقع تھا لیکن جیسے جیسے ڈسکو کی شہرت بڑھتی گئی تھی، ہوٹل کی انتظامیہ اُس کے اشتہاری بورڈ کی طرف سے غفلت اختیار کرتی گئی تھی۔

اب اُس کے اُوپر کے بلبوں کی قطار میں صرف درمیان کا ایک بلب روشن ہوتا تھا جو رات بھر دھیمی نیلی روشنی ٹپکاتا رہتا تھا۔ بورڈ کے نچلے حصّے سے بجلی کی اُلجھی ہوئی گردآلود تاریں لٹک آئی تھیں جن سے مسلسل "شرر شرر" کی ہلکی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔

شہر کے وسطی علاقے میں واقع ہونے کے باعث یہاں دن کے اوقات میں اس قدر ہنگامہ رہتا تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی، مگر شام کے سائے طویل ہوتے ہی ساری دُنیا سے رابطہ قائم رکھنے والے کاروباری مراکز بند ہو جاتے تھے اور ہر صبح اپنی ذیلی شاخوں سے دوبارہ منسلک ہو جانے والے دفاتر کے شیشے کے نازک دروازوں پر آہنی جالیاں اُتر آتی تھیں۔

اس کے باوجود فٹ پاتھوں پر سونے والے اس چوراہے کا رُخ نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رات پڑتے ہی اس علاقے میں ذرا ذرا سے فاصلے پر موجود ہوٹلوں کے بال رُومز اور ڈسکوز آباد ہو جاتے تھے جہاں سے تمام رات تُندوتیز موسیقی کی لہریں اُبھرتی تھیں اور وہاں آنے جانے والی کاروں کی روشنیاں رات کی تاریکی میں اچانک نمُودار ہو کر سڑک کے کناروں پر سونے والوں کی آنکھوں میں شدّت سے چُبھتی تھیں اور یُوں اُن کی نیند میں سماعی اور بصری خلل پڑتا تھا۔

بردلتیئے نے کچھ عرصہ پیشتر اپنے تین شاہ دولے کے چُوہے بیچ کر یہ ایک کوڑھی خریدا تھا۔ اتنا مہنگا فقیر خریدنے کی وجہ فقط یہ تھی کہ چُوہے ادھُورے ہونے کے باوجود بہر حال تین افراد شمار ہوتے تھے اور اس حساب سے اُن کی رہائش کے اخراجات تکلیف دہ حد تک بڑھتے جا رہے تھے۔ تین ناچیز منگتوں کی جگہ ایک بیش قیمت فقیر رکھنے کی خُوشی سے وہ ابھی پُوری طرح سرشار نہیں ہو پایا تھا کہ اچانک فٹ پاتھ کے ٹونگر نے ایک نیا قانون نافذ کر دیا تھا جس کے تحت کوڑھی فقیروں کی ریڑھیاں کھڑی کرنے کا الگ شبینہ دینا لازمی ہو گیا تھا۔

اُنہی پریشانی کے دنوں میں وہ ایک شام ٹھکانے پر واپس جاتے ہوئے اس جگہ دیہاڑی گننے

کے لئے رُکا تھا کہ یکایک اُسے سڑک پار کی اُونچی اور تیز روشنیوں کے نتیجے میں بورڈ کی پُشت پر پیدا ہونے والا گھنا اندھیرا شب بسری کے لئے نہایت موزُوں معلُوم ہوا تھا۔

ابتدائی چند راتیں اُنہوں نے موسیقی کے شور اور وقفے وقفے سے گذرنے والی کاروں کی روشنیوں اور بورڈ کی تاروں سے آتی ہوئی شرر شرر کی آواز کے باعث بے آرامی سے گذاری تھیں، مگر انہیں ان تمام چیزوں کا عادی ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔

رقم کے حساب سے فارغ ہو کر جب بچھونا تیار کرنے کے لئے برداشتینے نے اپنے فقیر کو اُٹھا کر اُس کے نیچے سے کمبل اور لوئیاں نکالیں تو اُس سے ایک بار پھر بولے بغیر نہ رہا گیا۔

"—— آج تو گاڑیاں ساتھ کی گلیوں تک پہنچ رہی ہیں۔ کہیں ہماری ریڑھی نہ اُٹھوا دیں۔"

اس بات پر برداشتیا چونک گیا تھا اور اُس نے پہلی مرتبہ گردن اُونچی کر کے سنجیدگی سے دائیں بائیں نظر دوڑائی تھی، اور پھر ڈسکو کا دروازہ کھولنے والے مچھندر سے اصل بات معلُوم کرنے کے لئے ہجوم میں گھستا چلا گیا تھا۔

واپسی پر اُس کا چہرہ مُسکراہٹ سے لبالب بھرا ہُوا تھا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ آج پُورا ایک سال ہو جائے گا——"

"کس بات کو پُورا ایک سال ہو جائے گا؟" کوڑھی نے حیرت سے بھرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"یہ تو تیرے باپ نے مجھے نہیں بتایا——" اس کے لہجے میں اچانک ایک عجیب انداز کا سرد پن شامل ہو گیا تھا—— "تو اب سوئے گا.....؟" اُس نے سسکاری بھرتے ہوئے بات مکمل کی تھی—— "یا فٹ بال بننے کا ارادہ ہے؟"

خوف زدہ کوڑھی کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلی تھی اور اُس نے برداشتینے کی نگاہوں سے بچنے کے لئے بورڈ کو گھُورنا شروع کر دیا تھا۔

اسے خیال آیا کہ سامنے سے دیکھنے پر کبھی کبھی بورڈ کے بلبوں کی اُوپر والی قطار میں واحد روشن بلب کسی آسمانی مخلوق کے ماتھے پر چمکنے والی تیسری آنکھ معلُوم ہوتا تھا —— اور اُس

نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس وقت بورڈ کے عقبی اندھیرے میں تھا۔ جونہی اُس کی نظر بورڈ کے نچلے حصے سے لٹکتی ہوئی تاروں پر پڑی اُسے وہ شخص یاد آ گیا جسے کئی سال قبل ایک بازاری لڑائی میں چاقو مار دیا گیا تھا اور وہ اپنے کٹے ہوئے پیٹ سے اُبل پڑنے والی آنتوں کو تھامے ہوئے اُس کی ریڑھی کے آگے آ گرا تھا اور اپنے وجُود کی پُوری قوت سے سانس لینے کی کوشش میں اُس کے مُنہ سے ایسی ہی شرر شرر کی آوازیں نکلی تھیں۔

اُس نے بوکھلا کر بورڈ سے نظریں ہٹائیں اور اپنا سر کمبل کے اندر گُھسا لیا۔

سونے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے وہ اُونگھنے کی حد تک پہنچنے میں کامیاب ہُوا تھا کہ اچانک اُسے محسُوس ہُوا جیسے آس پاس کی عمارتوں میں داخل ہونے والے تمام لوگ اچانک پاگل ہو گئے ہوں۔

شدت اور کثرت میں حد سے زیادہ ہونے کے باوجُود اب تک کوئی ایسی حرکت نہیں ہوئی تھی جو عام دنوں میں وہاں بالکل نہ ہوتی ہو۔ اور یہی وہ بات تھی جس کا خُود کو یقین دلا کر اُس نے ایک حد تک اپنے خوف پر قابو پا لیا تھا، مگر دھماکے اور چیخیں اور بے شمار کاروں کے بیک وقت بجنے والے بھونپُو سُن کر وہ ایک بار تو یُوں اچھل گیا تھا کہ ریڑھی پر خُود کو قائم رکھنے کے لئے اُسے اپنے ٹیڑھے میڑھے ہاتھ پاؤں چاروں کونوں میں اٹکانے پڑے تھے۔

چند لمحوں بعد اندھیرے میں ڈُوبی ہوئی عمارتوں کی روشنی تو واپس آ گئی تھی لیکن لوگ اب چیخ و پکار کرتے اور غُبارے پھوڑتے باہر سڑک پر نکل آئے تھے۔

اُس نے بدستور سوئے ہوئے برداشتے کی جانب مُنہ موڑ کر رشک اور حسرت سے لبریز آنکھیں جھپکیں اور ایک مرتبہ پھر کانوں پہ اُدھورے بازُو دھر کر دُہرا ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک اپنے سامنے ایک ایسے شخص کو کھڑے پایا جو پتہ نہیں کب بورڈ کے سائے میں پہنچ گیا تھا اور اب ریڑھی کے ساتھ لگ کر نہایت اطمینان سے اپنی پتلون کے بٹن کھول رہا تھا ـــــ اس سے پہلے کہ وہ خُود کو ہلکا کرتا، اُس نے کائنات کے اُس گوشے میں اپنی

موجودگی کا اعلان کیا۔

"اولاد والو! معذور ہوں ۔ مجبور ہوں"

پہلے تو اُس شخص کو یقین نہیں آیا ـــــ اور جب یقین آیا تو وہ یوں اُچھل پڑا جیسے اُس نے کرتب دکھانے کے بعد سرکس کے جھولے کے نیچے تنے ہوئے جال پر چھلانگ لگائی ہو۔

"مائی گڈنیس!" وہ ریڑھی پر لات مار کر چیخا۔ "آدھی رات کو بھیک مانگتا ہے ـــــ باسٹرڈ!"

ریڑھی لڑھکتی ہوئی جا کر سوئے ہوئے بردا نشتیئے کے سینے سے ٹکرائی اور وہ گہری نیند سے یوں اچانک بیدار ہونے کے باوجود صورتِ حال کو فوراً سمجھ گیا ـــــ اور اُس کے مُنہ پر لاتیں مارتے ہوئے دھاڑا ـــــ

"کوڑھ مغز! یہ کون سا وقت ہے آواز لگانے کا۔"




باشندہ

جُونہی بلّی نے بدن سمیٹ کر اپنی پیٹھ حیران کُن حد تک اُوپر کو اُٹھائی اور سانپ کی سی سسکاریاں بھریں وہ اس طرح اُچھل کر گرا جیسے اس نے بجلی کی ننگی تار پہ پاؤں دھر دیا ہو ——— نادانستگی میں زندہ تاریں چھُو لینے والے عام طور پر چیخ مار کر پیچھے ہٹتے ہیں اور چیخ کا کوئی واضح مطلب نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ انتہا کے لمحوں میں خود بخود پیدا ہو جانے والی وحشی قوّت کا فوری اظہار ہوتی ہے ———

کسی جذبے کا فوری اظہار ——— ذاتی اور سچّا اور معروضی سطح پر بے معنی ہوتا ہے ——— اس نے کھڑے ہو کر اپنے حواس مجتمع کئے اور کمرے کے کونے میں پڑے جھاڑو کے ڈنڈوں میں سے ایک ڈنڈا اُٹھایا اور بلّی کے سر پر اندھا دھند برسانے لگا ——— نو جانیں رکھنے والی پالتو مخلوق فرار کی راہیں بند پا کر جنگل کے کسی درندے کی طرح جھپٹی اور اس کا چہرہ لہو لہان کر گئی ——— کچھ دیر تک وہ دونوں ایک دُوسرے کو ہلاک کرنے کے لئے اپنی ساری مخفی قوّتوں اور چالاکیوں کے ساتھ حملہ آور ہوتے رہے ———

آخر بلّی کا سر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اُس کا بھیجا فرش پر بکھر گیا ———

سرد پانی سے اپنے چہرے کے رِستے ہوئے زخم دھونے کے بعد وہ کچھ دیر تک اپنے لرزتے ہوئے ——— سفید اور کالے بالوں سے ڈھکے ——— ٹیڑھے بھینگے ہاتھوں کو گرم سانس کی پھُونکیں مارتا رہا اور پھر تیزی سے سامان باندھنے میں مصرُوف ہو گیا ———

پہاڑوں پہ برفباری کا آغاز ہو چُکا تھا اور بلندیوں سے آنے والی تند ہوا سڑکوں کے

کنارے لگے شیشم کے درختوں کے زرد اور مٹیالے پتوں کی آخری کھیپ کو نابُود کر رہی تھی ـــ چھاؤنی کے علاقے اور نئے شہر کے گھروں کے آنگنوں میں لگے سفیدے اور شہتُوت کے درخت موسم سرما کے ابتدائی دنوں ہی میں عُریانی کی حالت کو پہنچ چکے تھے اس لئے وہاں شدید سردی کی لہر اب کسی طرح کا تغیّر پیدا کرتی نہیں دکھائی دیتی تھی ـــ

اندرُونِ شہر میں فرُوٹ اور سبزی منڈی سے گانٹھوں اور ٹرکوں اور پیٹیوں کے نیلام کئے جانے کی آوازیں کہرے میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ بلند تر ہوتی جا رہی تھیں اور اب اس کے کمرے میں سُنائی دے رہی تھیں جو اس بات کا ثبوت تھا کہ رات آدھے میں تقسیم ہونے کے بعد صبح کاذب سے مل رہی تھی ـــ

کمرہ چالیس پچاس سال قبل کے بنے ہُوئے کسی عالیشان مکان کا حصّہ تھا اور اس کی فضا میں روحانیت کا رنگ غالب آچکا تھا جیسے ہر قدیم چیز زمانہ گذرنے کے ساتھ کم سے کم جسم اور زیادہ سے زیادہ رُوح کی حامل ہوتی چلی جاتی ہے ـــ کمرے کی چھت بے حد اُونچی تھی اور اس کے شہتیروں کو دیکھ کر سمجھ میں آتا تھا کہ "عمارتی لکڑی" سے گاؤں والوں کی کیا مُراد ہوتی ہے ـــ چھت سے ایک اسٹریٹ لیمپ کی طرح کی چیز بجلی کی گانٹھیں لگی دوہری تار سے لٹک رہی تھی۔ اس جھُولتے ہوئے لیمپ میں کوئی بلب نہیں تھا اور خالی شیڈ پر گرمیوں کے دنوں میں حکمرانی کرنے والی مکھیوں نے کوئی جگہ صاف اور بے داغ نہیں رہنے دی تھی ـــ

کمرے کے ایک کونے میں بجلی کا ڈبل راڈ ہیٹر تھا جس کی اُوپر کی راڈ بیچ میں سے ٹوٹی ہوئی تھی ـــ ہیٹر کے آس پاس گندی پیالیوں اور دُوسرے روزمرّہ کے استعمال کے برتنوں کی موجودگی اس بات کی دلیل تھی کہ کھانا گرم کرنے اور چائے وغیرہ بنانے کے لئے وہی بجلی کا ہیٹر استعمال ہوتا ہے ـــ کمرے کے دُوسرے کونے میں مچھر دانی کو سہارا دینے والے ڈنڈے اور جوتے اور میلے کپڑے ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے ـــ تیسرے کونے میں بلّی کے دودھ کی پلیٹ اور اُس کا کچلا ہُوا سر اور بکھرا ہُوا مغز تھا ـــ چوتھے کونے کو اس کے نواڑی پلنگ نے

ڈھکا ہُوا تھا جس کے موٹے اور مہارت سے پیچ و خم کھائے ہوئے پایوں پر شوخ رنگوں کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے جو رنگ برنگی ٹائیلوں سے بنے ہوئے فرش سے پھُوٹ نکلنے والے خوُد رو پودے دکھائی دیتے تھے ——

گذشتہ ہفتے اس کے دونوں بیٹے ایک مرتبہ پھر اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آئے تھے اور اپنی سعادتمندی کے مظاہرے سے گلی والوں کے دل جیت کر چلے گئے تھے —— اُس نے ایک مرتبہ پھر پرانے شہر کے گرد و نواح میں تعمیر ہونے والی جدید بستیوں کا مذاق اڑایا تھا اور اپنے بیٹوں کو حسبِ دستور شہر چھوڑ کر دیہاتی ماحول میں جا بسنے کا طعنہ دیا تھا ——

اس کی دُرشت اور کھُردری آواز اور ضدّی بچّے کی سی اُچھل کُود سے ایک مرتبہ پھر گلی کے نانبائی اور قصائی اور موچی اور ترکھان اور ریڑھیوں اور خوانچوں والے اور گرم حماموں کے مالک اپنی دکانوں اور تھڑوں اور ڈیوڑھیوں کو چھوڑ کر اس کی دہلیز پر جمع ہو گئے تھے —— ہمیشہ کی طرح اُس کا منہ کف آلود ہو چکا تھا اور گاڑھا لعابِ دہن —— بے قابو تھوک اور جھاگ کی صُورت میں اُبل اُبل کر اُس کے دونوں ہونٹوں کے کونوں سے بہہ رہا تھا اور بے ترتیب داڑھی کے بالوں میں غائب ہو رہا تھا اور پھر وقفے وقفے سے داڑھی کے بالوں کی پشت سے اچانک نمودار ہو کر اُس کی شیروانی کے اوپر دُودھ کے قطروں کی طرح ٹپک رہا تھا اور جذب ہو رہا تھا ——

وہ عادت کے مطابق اُکتی ہوئی اور ناگوار حد تک بلند آواز میں اپنے بیٹوں کو ڈانٹنے پھٹکارنے کے بعد اچانک خاموش ہو گیا تھا اور اب اس نے اپنی آنکھیں وہاں مرکوز کر دی تھیں جہاں کوئی بھی نہیں ہوتا —— محلّے کے دوسرے بوڑھے جانتے تھے کہ یہ وہ حرکت ہے جو اصیل مُرغے لڑائی میں جان کی بازی لگا دینے سے قبل کرتے ہیں —— جب وہ حریف کی آنکھوں میں موت کا عکس دیکھنے سے وقتی طور پر توجہ ہٹا لیتے ہیں اور اپنی گردن کے دائرہ وار پھُلائے ہوئے پروں کو واپس سمیٹ لیتے ہیں اور دائیں بائیں فرضی دانے دُنکے پر چونچیں مارتے ہیں اور بے حد اطمینان اور فراغت کا اظہار کرتے ہیں اور اس طرح اپنے چٹختے ہوئے اعصاب کو ٹھنڈا کرتے ہیں ——

وہ اسی اصول کے مطابق خود کو سرد کرنے کے بعد دھیمے مگر کاٹتے ہوئے لہجے میں وہی باتیں کرنے لگا تھا جواب اتنی مانوس اور مخصوص ہو چکی تھیں کہ کھڑکیوں اور چلمنوں اور کوٹھوں سے جھانکتی ہوئی بہو بیٹیوں تک کو ازبر ہو گئی تھیں اور وہ ایک دوسرے کے صحنوں میں جھانک کر گفتگو کرتے ہوئے یا باقاعدہ ملاقات کے وقت یا مشترکہ کوٹھوں پر دھوپ تاپتے ہوئے اکثر بڈھے شیخ کی یہ باتیں دہرا کر لطف اندوز ہو چکی تھیں اور کڑکتی ہوئی انگڑائیاں لیتے ہوئے بڑھاپے میں سٹھیا جانے کے مرض سے پناہ مانگ چکی تھیں ——

"—— اگر چاچا عطا اللہ کی جگہ کوئی ہمیں کہے ——" وہ اکثر ایک دوسرے کو کوہنیاں چبھوتے ہوئے کہتیں "—— تو ہم آج سرکاری اسکیم والے علاقوں میں رہنے چلی جائیں ——" پھر وہ بے اختیار ہنس پڑتیں "—— مگر چاچا کو کوٹھیوں میں دیہاتی رہتے نظر آتے ہیں ——"

"تم شیخ عطا اللہ کو بے گھر نہیں کر سکتے ——" اُس نے اس نظام سے نظریں ہٹالی تھیں جہاں کوئی نہیں ہوتا اور حسبِ معمول آج بھی اُسی مخصوص جملے سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تھا "—— ہم شہری لوگ ہیں —— زمیندار ہمیشہ ہماری عزت کرتے رہے ہیں —— تم اب بھی میری اور اپنے دادا کی شہر والی دکانوں سے اندھی کمائی کرتے ہو اور کہتے ہو شہر کا علاقہ رہائش کے لئے ٹھیک نہیں ہوتا —— کیوں؟ —— میں پوچھتا ہوں کیوں؟ ؟ اس لئے کہ یہاں سے ریلوے اسٹیشن نزدیک ہے جہاں سے آنے والی رونقیلی آوازیں تمہارے کانوں میں چبھتی ہیں —— اسی لئے! اور کیا —— اسی لئے کہ یہاں منڈیاں ہیں دستکاریاں ہیں اور چھاپے خانے ہیں اور سازندوں کی ٹولیاں ہیں اور شام کے وقت اندھے فقیر آوازیں لگاتے اور روتے رُلاتے گذرتے ہیں اور شب برات کو اٹرکے پٹاخے چلاتے ہیں جس سے تمہارے بچّوں کے جی دہل جاتے ہیں اور محرّم کے دنوں میں امام کی سبیلوں کی گندگی پھیلتی ہے اور میلادالنبیؐ کا جلوس راستے بند کر کے مظاہرے کرتا ہے —— شہر میں تو روز ہی کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے —— ہم لوگ دیہاتیوں کی طرح سالانہ میلے کا انتظار نہیں کر سکتے —— تم خود جب چھوٹے تھے تو عاشوروں کی دیگ چڑھاتے تھے اور رات بھر گتکا کھیلتے تھے اور دونوں فرقوں

کی لڑائی بچانے کے لئے ڈیوٹیاں دیتے تھے ـــــ اب جس علاقے میں تم نے مکان بنوا لئے ہیں وہاں تو گاؤں کا ماحول ہے ـــــ تم دیہاتوں میں بس گئے ہو اور تمہیں یاد ہے جب دیہاتی خریداری کیلئے شہر آتے تھے تو لاری اڈے پر لوگ اُن کا کیسا کیسا مذاق اڑاتے تھے ـــــ سُن لو! میں شہر کا مکان نہیں چھوڑوں گا ـــــ نہیں چاہیئے مجھے تمہارے نئے رہائشی علاقے اور منصوبے اور آسائشیں ـــــ ہم کاروباری برادری کے لوگ ہیں اور ہمیشہ رونق والی جگہوں پہ رہے ہیں ـــــ"

پھر اچانک اس کی نظر اپنے چھوٹے بیٹے پر پڑ گئی جو کسی عام ضرورت والے سرکاری محکمے کا افسر تھا اور وہ خاموش ہونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اُچھل پڑا" ـــــ اور تم تو ایک جگہ ٹھہرتے ہی نہیں ـــــ یہ خوب ہے ـــــ دیہاتی ماحول میں رہو اور خانہ بدوشوں کی طرح رہو ـــــ یہ خوب ہے ـــــ بے گھر ہو جاؤ اور در بدر بھی ہو جاؤ ـــــ"

اُس کا چھوٹا بیٹا جو اپنی محدود آمدنی اور لامحدود اختیارات سے تنگ آچکا تھا سرکاری نوکری چھوڑنے کے بعد سیاست میں حصّہ لینے اور اپنے آبائی محلے کی سیٹ سے الیکشن لڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اپنی نیکدلی اور حقوق العباد کا خیال رکھنے کے سلسلے میں وہاں کے لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ ہر چند کے اُس نے اپنے دُوسرے بہن بھائیوں کی طرح اندرُون شہر کی رہائش ترک کر دی تھی تاہم اُس نے اپنے محلّے کے چوک کے حلوائیوں کو ٹیلی فون کے کنکشنز دلوائے تھے اور اُن گلیوں میں جہاں وہ کھیل کُود کر جوان ہُوا تھا پانی کی نئی لائنیں ڈلوائی تھیں اور گٹروں کا پُرانا نظام دُرست کروایا تھا ـــــ اُس نے محلّے کی ایک مخبوط الحواس عورت کو پتہ نہیں کس سرکاری فنڈ سے ماہوار وظیفہ لگوا دیا تھا جس کے بعد آس پاس کی گلیوں کی تمام مجبور اور بے سہارا عورتیں اُس کے سرکاری مکان پر پہنچ کر اُس کی منتیں کر چکی تھیں مگر اب تک ناکام رہی تھیں ـــــ وہ پاگل عورت وظیفہ لگنے کے بعد اب بھی کبھی کبھی چوک کی طرف آنکلتی تھی اور کسی جانور کو ذبح کرنے کی اداکاری کرتی تھی اور اس دوران وہی جملے ادا کرتی تھی جو وہ دماغ خراب ہونے کے بعد سے اب تک کرتی آئی تھی ـــــ " ـــــ تم تو بڑے تیز نکلے ـــــ اللہ اکبر ـــــ تم اتنے چالاک تھے اور مجھے کچھ بھی پتہ نہیں تھا ـــــ اللہ اکبر ـــــ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

۔۔۔ اللہُ اکبر ۔۔۔"

لیکن اُس دن شیخ عطااللہ کا چھوٹا بیٹا محلّے والوں کے سامنے اُس کے آگے زبان چلا بیٹھا۔۔۔ "۔۔۔ ابّاجی آپ کا دماغ پہلے جیسا نہیں رہا ۔۔۔ آپ کیوں نہیں سمجھتے ؟ ۔۔۔ سارے عزیزوں اور محلّے داروں میں بدنامی کرادی ۔ کتّے کو زہر دینے کی کیا ضرورت تھی ؟ ۔۔۔ آپ کیوں نہیں سمجھتے ؟ ۔۔۔"

اپنے بیٹے کے جواب پر اُس کا خاموشی اختیار کرلینا اتنا غیر متوقع تھا کہ سب سناٹے کی لپیٹ میں آگئے ۔۔۔

اس رات حکیم صاحب کے دواخانے پر وہ محلّے کے دُوسرے وضعدار بوڑھوں کے چلے جانے کے بعد اٹکتے ہوئے لہجے میں اُن سے مخاطب ہُوا ،" ۔۔۔ آپ کو تو خبر پہنچ گئی ہوگی کہ ثناءاللہ نے آج مجھ سے کیا کہا ؟" ۔۔۔ جب حکیم صاحب نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ انتہائی شکستہ آواز میں بولا ۔۔۔ "آپ حکیم صاحب خُود اس شہر کے باشندے ہیں ۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ یہاں کے شہریوں نے کیسی کیسی اعلیٰ نسل کے بٹیروں اور مرغوں کے جوڑ کرائے ہیں اور کتنے اُونچے پیمانے پر کبوتر بازی کی ہے ۔۔۔ مجھے یاد ہے آپ کے داداجان کی چھت سے کبوتروں کی ٹکڑی اڑتی تھی تو آسمان چھُپ جاتا تھا اور محلّے والے اُسے ٹڈی دل ، کہتے تھے ۔۔۔ لیکن کتّوں اور گھوڑوں اور بیلوں سے شہر والوں کا کیا واسطہ ؟ ۔۔۔ چوپائے تو کسانوں کے جانور ہوتے ہیں ۔۔۔ میں نے کتّا اس کی وفاداری کے قصّے سُن کر پالا تھا ۔ ایک دن اُسے کھانا ڈال کر یاد آیا کہ کچھ اور ہڈیاں بھی بچ گئی ہیں ۔۔۔ بس وہی ڈالنے کے لئے راتب کا برتن کھینچا تو مجھ پر غرّانے لگا ۔۔۔ آپ یقین کریں باقاعدہ نفرت سے ذلیل آواز میں بھونکا ۔۔۔ ایسے پالتو کو اگر آدمی زہر نہ دے تو کیا کرے ۔۔۔ ؟"

حکیم صاحب اور شیخ عطااللہ پُرانے ہم جماعت تھے اور بچپن میں ایک ہی تانگے پر اُس اسکول جاتے رہے تھے جس کی عمارت بعد میں شہری انتظامیہ نے مخدُوش حالت کے سبب ڈھادی تھی ۔۔۔ اس لئے انہوں نے شیخ صاحب کی بات بہت ہمدردی سے سُنی اور مستقل تائید میں سر ہلایا اور مطّب

بند کرنے سے پہلے اُن کو وہ خمیرہ تیار کر کے دیا جو قلب کو تقویّت پہنچاتا ہے ۔

بلّی اُس نے چار پانچ روز قبل پالی تھی اور اس کی خاموش اور پُر سکون حرکات سے اُس کا دِل خوش ہو گیا تھا ۔ آج اُس نے ساتھ کے چھوٹے کمرے میں بلّی کے لئے پُرانی بوری کا گرم اور آرام دہ بچھونا تیّار کیا تھا اور جب بلّی نے دودھ ختم کر لیا تھا تو وہ اُسے نئے بستر پر لے جانے کے لئے اُس کی جانب بڑھا تھا کہ اچانک گھریلو اور نرم خُو جانور نے اپنا بدن سمیٹ کر پیٹھ حیران کُن حد تک اُوپر کو اٹھائی تھی اور اپنی آنکھوں میں سارے جہان کی نحوست اور مکاّری اور بے وفائی بھر کر اُسے گھُورا تھا اور سانپ کی طرح سسکاریاں بھری تھیں جس سے وہ یُوں اُچھل کر گِرا تھا جیسے اُس نے بجلی کی ننگی تار پر پاؤں دھر دیا ہو ۔




آبادی

سنگِ مرمر کے بنے ہُوئے اس خوبصورت مقبرے میں کوئی بھی دفن نہیں ہے۔ بقیہ تمام چھوٹی بڑی قبروں کے کتبے سچ بولتے ہیں۔ سفید پتھر والی قبریں تو زیادہ تر میں نے خود کھودی ہیں اور وہ قبریں جن کی حد بندیاں ابھی باقی ہیں میرے بیٹوں کے ہاتھوں کی بنی ہُوئی ہیں۔ جن قبروں کے کالے پتھر بھُر بھُرے ہو چکے ہیں میرے باپ دادا کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ مگر میں جانتا ہُوں کہ ان سب میں کوئی نہ کوئی دفن ضرور ہے، سوائے سنگِ مرمر کے بنے ہُوئے اس نیلے گنبد والے مقبرے کے، تمام قبروں میں مُردے موجود ہیں۔

پچھلی جمعرات کو میں مقبرے کے جھنڈے درست کرنے گیا تو تحصیل سے آئے ہُوئے اسکول ماسٹروں میں سے ایک نے پوچھا، "کیا یہ درست ہے کہ یہاں کوئی بھی دفن نہیں ہے؟"۔ میں نے کہا "میراثی اگلے جہان تو نہیں چلے گئے، ان سے پوچھ لو، قائم خان کے دو بیٹے تھے۔ اُس کا جھلّا بیٹا نہیں ہے"۔ یہ سُن کر شک کرنے والے ماسٹر نے تمام تنگی مزاج لوگوں کی طرح دیر تک دعائیں مانگیں اور شیرینی کی رقم بجائے صندوقچی میں ڈالنے کے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ پہلے والا زمانہ ہوتا تو ممکن ہے وہ میرے جواب پر مجھے گالیاں دیتے اور تھپڑ مارتے جیسے میرا باپ اکثر بے عزت ہو جاتا تھا مگر اب دنوں کے پھیر میں ایسی بے قدری پر قبرستان بدلے جا سکتے ہیں اور پھر ان بے سُوگوں کے مُردے گُتّے کھاتے جیسے کسی زمانے میں گیدڑ کھا

جاتے تھے۔ یوں تو اب بھی موقع ملنے پر گُر بجّو سرنگ لگا کر قبر کا سالم مُردہ کھا جاتا ہے۔ مگر جو دیکھنے میں نہ آئے مکروہ نہیں ہوتا۔

میں نے جھلّے شاہ کو بچپن میں پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب دونوں کُتّے ایک دوسرے کی گردن میں چک ڈالنے کے لئے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو چکے تھے۔ "ملکوں" کا گینڈے کی جسامت والا کُتّا کھڑا ہونے پر ملک شیر باز سے بھی اُونچا دکھائی دے رہا تھا حالانکہ ملک کی دُہرے شملے والی پگڑی کماد کی کھڑی فصل میں بھی نظر آجاتی تھی، لیکن شہر والوں کا نوکیلے مُنہ والا بُل ٹیریا باقاعدہ داؤ پیچ سیکھا ہُوا لگتا تھا اور ملکوں کے ببرُو کی گُدّی پر پہنچنے کے بجائے اُس کے گلے کی نچلی نرم کھال پر اپنے اناج کی بوریاں سینے والی سلائیوں جیسے دانت گاڑ رہا تھا۔ ملک شیر باز کی پگڑی اپنے ببرُو کو اُچھل اُچھل کر داد دینے کے دوران گر گئی تھی اور اب اس کا قد اپنی ڈانگ سے بھی چھوٹا لگ رہا تھا اور اس کی شخصیت میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی جس کی وجہ سے علاقے کے سرکاری افسر بھی اُس سے ادب سے بات کرتے تھے۔

شہر والوں نے اپنے سُرخ ناک والے کُتّے کو برانڈی پلائی تھی اور خود ولایتی کی وہ بوتلیں خالی کر کے پھینکی تھیں جو میرا باپ کباڑیئے کو دے کر اتنی رقم لے آتا تھا جس سے اس کی دیسی کا مٹکا تیار ہو جاتا تھا۔ جب شہریوں کے بُل ٹیریا نے ببرُو کے سینے کو دبوچ کر پلٹا مارا تو دونوں گھمیریاں کھاتے شیشم کے اس درخت کے نیچے پہنچ گئے جس کی شاخ پر قائم خان کا جھلّا بیٹا الّو کی طرح آنکھیں لٹکا کر لہولہان ہوتے جانوروں کو دیکھ رہا تھا اور ہلاشیری کی آوازیں نکال رہا تھا۔ جھلّا مرغوں کی بھڑائی والے دن بھی یوں ہی درخت پر چڑھ بیٹھا تھا اور سارے جوڑ دیکھ کر سورج ڈوبتے نیچے اُترتا تھا مگر جس طرح آج دونوں کُتّے ایک دوسرے کے چیتھڑے اُڑا رہے تھے کوئی اور ہوتا تو ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ بندر کی طرح عین اُن کے درمیان آ ٹپکتا۔ مگر جھلّا اب دونوں کُتوں کی ہمت بڑھاتے بڑھاتے ملک شیر باز کے "ببرُو" کی حمایت میں چیخ رہا تھا ـــــ "ببرُو" بہرحال اس کے علاقے کا جانور تھا اور بچپن سے اس کی آواز پہ دُم ہلاتا

آیا تھا اور اس کے کان ملک شیر باز نے اُسی سے کٹوائے تھے ۔ "نازک جگہ پکڑ وا بیٹھا ہے ملک جی ! زیادہ چکنائی کھلادی ! ۔۔۔ رگڑائی بھول گیا ہے!"

ملکوں کا کُتا ہر چند کہ اُوپر تھا اور دیکھنے والوں کو بہتر صورتحال میں دکھائی دے رہا تھا مگر جاننے والے جانتے تھے کہ نیچے لیٹے ہوئے شہری کُتے نے "ببرو" کے ڈھیلے گوشت کی گرفت لے رکھی ہے اور اب جب تک اُسے زمین پر رگڑ لگنے کی اذیت نہیں پہنچے گی وہ جبڑا نہیں کھولے گا ۔۔۔ ببرو نے دو تین مرتبہ نچلے کُتے کو رگیدنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ایسا کرنے پر ہر دفعہ اس کے اپنے سینے کا گوشت اُکھڑنے کی تکلیف اُس کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی تھی ۔۔۔ اور اب وہ اپنی کانپتی ہوئی ٹانگوں پر بے حس و حرکت کھڑا تھا ۔۔۔

"چھنڈا لگا ۔۔۔! چھوٹ جائے گا! ۔۔۔ ایک بار چھنڈا لگا دے نیچے روڑے ہیں!"

ملک شیر باز اب اپنے منہ کو کُتے کے کٹے ہوئے نوکیلے کانوں کے پاس لاکر ہذیانی آوازیں میں چیخ رہا تھا ۔۔۔ وہ اس جگہ سے اُٹھنے والی بے پناہ دھول سے قطعی بے نیاز تھا جہاں کُتے ایک دوسرے سے گتھم گتھا پھرکیوں کی طرح گھوم رہے تھے ۔۔۔

"تیری ٹانگیں کانپ رہی ہیں کم نسل تیری ماں تو پچھلی ٹانگوں پر گدھوں کا بوجھ اُٹھا لیتی تھی۔"

مایوس ہو کر وہ اپنی مخصوص گالیوں پر اُتر آیا تھا۔ خونخوار جانور اب بھیانک آوازیں نکالتے لڑھکنیاں کھاتے کانٹے دار جھاڑیوں کی حفاظتی دیوار کو پامال کرتے ہوئے بے فصلے کھیت میں داخل ہو گئے تھے ۔۔۔

اور اب ہر طرف دھول ہی دھول تھی ۔۔۔ بنجر کھیت کے اندر لوگوں کی دائرہ دار اُچھل کود سے اُٹھنے والی دھول ۔۔۔ بارش کو ترسی ہوئی جھاڑیوں کی اچانک اُتھل پتھل سے پیدا ہونے والی دھول ۔۔۔ ملک شیر باز کے بیٹوں کی ڈانگوں سے اُڑنے والی دھول، کیونکہ اب وہ اپنے کُتے کے نزدیک بیٹھے زمین پر لاٹھیاں مار مار کر اُسے ہدایات دے رہے تھے ۔۔۔

ویران کھیت کے اُوپر شور و غل اور گرد و غبار کا گنبد سا بن گیا تھا اور دُور سے دیکھنے والے

کو یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے جنازے کے ساتھ چلنے والا ہجوم اچانک اُٹھنے والے جھکڑ کی زد میں آ گیا ہو — لیکن ایک دُوسرے کو بھنبھوڑتے ہُوئے جانور اب دُھول نہیں اُڑا رہے تھے کیونکہ ان کے جسم خون سے لتھڑ گئے تھے اور مٹی ان کے زخموں سے بہنے والے لہُو سے کیچڑ بن چکی تھی۔

شیشم کے درخت کے نیچے سے سُوکھے کھیت تک وہ ایک دُوسرے کے اُوپر نیچے ہوتے لڑھکتے گئے تھے اور اس دوران موقع ملنے پر ببرُو نے کئی مرتبہ شہری کُتے کو اِدھر اُدھر سے ادھیڑ ڈالا تھا مگر بل ٹیریا نے کسی بھی حالت میں اپنے سے کہیں زیادہ طاقت ور جانور کے سینے پر مُنہ بھر کے ڈالی ہُوئی گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی — قائم خان کے جھلّے بیٹے نے بل ٹیریا کو لڑائی کے اس سنہری اصُول پر اتنی سمجھداری اور جی داری سے عمل کرتے دیکھ کر اب اس کی تعریف میں بھی نعرے لگانے شروع کر دیئے تھے اور جب ملک شیر باز کے بیٹوں نے کُتوں کے خون سے گارا بنی ہوئی زمین پر لاٹھیاں برسانے کے ساتھ ساتھ نیچے لیٹے ہُوئے بل ٹیریا کی نازک جگہوں کو بھی کچوکے لگانے شروع کر دیئے تو وہ درخت سے کُود کر ان کے سروں پر پہنچ گیا۔

"یہ بے دینی کا کام ہے ملک جی! شہریوں کا جانور اپنے علاقے سے باہر لڑا ہے! — بے انصافی نہ کرو نسلی جانور ہے!"

کوئی اور اس طرح کہتا تو ملک شیر باز اس کے مُنہ پر اپنی ڈانگ کا لوہے والا سِرا مار کر اس کے سارے دانت توڑ ڈالتا مگر اُسے علم تھا کہ جھلّا اور کم عقلا کہلانے کے باوجود وہ قائم خان کا بیٹا ہے جو اپنی فصل خراب کرنے والے مویشیوں کو گولی مار دیتا تھا اور گاؤں والوں کو بھی اجازت دیتا تھا کہ اس کے جو مویشی ان کی فصل کا نقصان کریں انہیں موقعے پر گولی مار دی جائے "ڈنگر پھاٹک میں دینے کا مطلب گھر کا معاملہ سرکار کے حوالے کرنا ہے" وہ اکثر کہتا تھا — اور اس نے اپنے ایک مزارعے کو اس بات پر گلا دبا کر ادھ مُوا کر دیا تھا کہ اس نے کھڑی فصل میں گھس آنے والی بکری کو بجائے گولی مارنے کے ذبح کر کے کھا

لیا تھا اور پھر اس کے سینے پر کھڑے ہو کر کہا تھا کہ "بے اصُولا آدمی زنا بھی کر سکتا ہے۔"

قائم خان تو مدّت ہوئی گذر چکا تھا مگر ملک شیر باز اس کے بڑے بیٹے دائم خان سے بھی آشنائی رکھتا تھا جس کا قول علاقے بھر میں مشہور تھا کہ "اگر میں بے اولاد نہ ہوتا تو نہری محکمے کے افسروں کو قتل کر چکا ہوتا۔" سب جانتے تھے کہ اس نے اپنی بانجھ بیوی کی ٹانگ پر "چکی" کا پاٹ مار کر اُسے اس بات پر لنگڑی کر دیا تھا کہ اس نے اُس کے جھلّے بھائی کے حصّے میں آئی ہوئی حویلی کو پاگل خانہ کہہ دیا تھا۔

اپنے انوکھی عادتوں والے چھوٹے بھائی کو وہ پیار سے "سائیں جی" کہتا تھا اور علاقے کا کوئی معتبر سے معتبر آدمی بھی اس کے سامنے ناسمجھ بھائی کو اس کے سامنے جھلّا نہیں کہہ سکتا تھا ——"وہ بے عقلی کی حرکتیں اپنے لئے کرتا ہے۔ کسی کو تو کچھ نہیں کہتا۔" دائم خان اکثر اس کے بارے میں کہا کرتا ——

اب "جھلّا" خون کے چھینٹے اُڑاتے کتّوں کے ساتھ لیٹ گیا تھا اور شہریوں کے بُل ٹیریا کو دلیریاں دے رہا تھا ——

"تُو جانتا ہے "پکڑ" بس ایک جگہ پہ ہو اور خاص جگہ پہ ہو تو جڑیں کاٹ دیتی ہے، تُو سمجھدار ہے !——

اس نے ملک شیر باز کے چھوٹے بیٹے کو بھی قینچی ڈال کر زمین پر اپنے ساتھ دے پٹخا جو اب نچلے کتّے کی ٹانگیں پکڑ کر اُسے نوکیلے پتھروں کی طرف گھسیٹ رہا تھا ——"اس طرح نہ کر تجھے ملکانی کے دودھ کی قسم اس طرح نہ کر! وہاں اُس کی کھال اُدھڑ جائے گی! نسلی حیوان ہے! اپنے علاقے سے باہر لڑا ہے!" —— لیکن جب ملک کے بیٹے ایک دوسرے سے پیوست کتّوں کو ناجائز جگہ کھینچ کر لے گئے تو وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور جھگڑے کے انداز میں شہر سے آنے والوں کے سامنے جھومنے لگا "تم فکر نہ کرو —— تمہارا جانور سمجھدار ہے۔ اصُول جانتا ہے۔ روڑوں پر بھی "پکڑ" ڈھیلی نہیں کرے گا!"

ملک کے نوکروں کا گھیرا اب بے جان ہوتے ہوئے کتوں کا رُخ نہر کی کنڈیالی زمین کی طرف موڑ چکا تھا۔ بل ٹیریا کی کمر نوکیلے پتھروں اور لوہے کی میخوں جیسے کانٹوں سے مسلسل چھلنی ہو رہی تھی اور ملک شیر باز اب کھُلم کھُلا اس کے نازک حصے پر اپنی ڈانگ کے نوکیلے سِرے سے چوٹیں لگا رہا تھا ۔۔۔ مگر اُس کے جبڑے ایک بار بھی نہیں کپکپائے تھے۔ اس کی گرفت بدستور قائم تھی ۔۔۔

شہر سے آنے والے جانتے تھے کہ تمام زیادتیوں کے باوجود کچھ دیر میں ان کا کُتا ملک شیر باز کے کُتے کا سینہ اُکھاڑ پھینکے گا اور اُسے ہمیشہ کے لئے معذور کر دے گا ۔۔۔

گاؤں کی فضا اچانک انتہائی کشیدہ اور سنگین ہو گئی تھی۔ صحنوں کی دیواروں سے عورتوں کے رنگ برنگے دوپٹوں میں لپٹے سَر اُبھر آئے تھے۔ نابختہ عمروں کی لڑکیاں گھروں کی منڈیروں پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی تھیں اور اپنے بھائیوں کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں جو یہ مقابلہ اس قدر نزدیک سے دیکھ رہے تھے۔ ملک شیر باز کی بیوی اپنی حویلی کی چھت پر کھُلے سَر بے صبری کے عالم میں ٹہل رہی تھی۔ تمام گاؤں جانتا تھا کہ برُو کی ماں ملکانی کے مرحوم باپ کی کُتیا تھی اور ملکانی برُو کو اپنے میکے سے اس وقت لائی تھی جب اُسے ماں کے پیٹ سے نکلے اتنا وقت بھی نہیں گُذرا تھا کہ اس کی آنکھیں کھُل سکیں۔ اس لئے کہ ملک شیر باز نے اُسے اپنے باپ کے گھر جانے کی اجازت ہی اس شرط پر دی تھی کہ "چاہے ہاتھ ڈال کر نکالنا پڑے، پہلا "نر" لے آنا"

جس دن "برُو" نے دریا کے کنارے ایک سوٗر کو تن تنہا چیر دیا تھا تو اس نے چودھرانی کو چھاتیاں تان کر بتایا تھا کہ یہ وہ سوٗر نہیں تھا جو ایک ساتھ کئی پیدا ہوتے ہیں اور غول میں ناکارہ پھرتے ہیں۔ یہ وہ تھا جو سوٗرنی اکیلا ہی جنتی ہے اور جو اکیلا ہی گھومتا ہے اور خاص وقت پر دس خنزیروں پر حاوی ہوتا ہے" ملکانی کو فخر تھا کہ وہ شکاری کی بیٹی تھی اور جانوروں کی گہری پہچان رکھتی تھی۔ لیکن آج اُسے مسلسل خبریں مل رہی تھیں کہ نیولے کے مُنہ والا کُتا اپنے تمام دانت "برُو" کے سینے میں اُتار کر اُلٹا لیٹ گیا ہے اور اُن کا کُتا ناتوانی سے ڈھنے والا ہے"

"ملک پھر عدالت کچہری کر دے گا۔" یہ خیال ملکانی کو مزید مضطرب کئے ہوئے تھا۔

ہنگامے کے مرکز میں صورتِ حال واضح ہو گئی تھی۔ ببرو کا سینہ اُکھڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ دونوں جانور خون میں اس طرح لتھڑ گئے تھے کہ پہلی نظر میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ کون بھاری پڑ رہا ہے مگر پرانے شوقین جانتے تھے کہ ملک شیر باز کا کتا اب خون کی کمی کے باعث بے دم ہو چکا ہے اور اُس کا سینہ، گوشت کے ایک بڑے لوتھڑے کی شکل میں باہر آنے والا ہے۔

لڑائی کے آخری مرحلے میں وہی ہوا جس کا شہریوں کو ڈر تھا اور جس سے اُن کے چہرے فتح مندی کے احساس کے باوجود زرد پڑ چکے تھے۔

ملک شیر باز نے اپنے کلہاڑی بردار نوکر کو اشارہ کیا اور فضا پر موت کا سکوت طاری ہو گیا۔ جنونی آوازوں اور گرد و غبار سے اَٹے لوگ یوں دم بخود کھڑے ہو گئے جیسے گرمیوں کی حبس زدہ سہ پہروں میں قبرستان کے درخت ہوں۔ قائم خان کے "جھلّے" نے ملک شیر باز کی ماں کے دودھ میں خرابی کا راز مجمع پر باآوازِ بلند ظاہر کیا اور کسی پاگل کے اندر آ جانے والی پُراسرار وحشی طاقت سے کام لیتے ہوئے ایک دوسرے سے نتھی کتوں کو، جو اب ہانپنے کے بجائے، ہچکیوں سے سانس لے رہے تھے، نہر کے پانی کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ خوفناک جسارت والے جانور جو آپس میں گتھے ہوئے تھے جھلّے شاہ کے دھکوں سے فصلوں پر چلنے والے ٹریکٹر کے پہیئے کی طرح لڑھکتے ہوئے نہر میں ایک بڑے چھپاکے سے جا گرے۔ یخ پانی میں غوطہ کھاتے ہی دونوں کتے دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح ایک سسکی کے ساتھ سرد ہو گئے اور پانی کی سطح سے منہ نکال کر مختلف سمتوں میں تیرنے لگے۔ دونوں کے جسموں سے بہنے والا خون نہر کے پانی پر سرخ چادر سی بچھاتا چلا گیا۔

لوگ بدستور گرمیوں کی حبس زدہ سہ پہروں والے درخت بنے ہوئے تھے۔ جھلّے شاہ کی حرکت نے اُن کی دلی خواہش کو عملی شکل دی تھی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ

مقابلہ اتنی آسانی سے سب کی خواہش کے عین مطابق برابری پر چھوٹ جائے گا۔ جھگڑے کی کوئی بات نہیں رہی تھی ــــ۔

"لیکن تیرے بھائی نے رڑے میدان میں مجھے پیدا کرنے والی کو بُرا کہا ــــ" ملک شیر باز اپنے نیزے کی چمکتی ہوئی انی کا رُخ دائم خان کی آنکھوں کے سامنے نچا کر دھاڑا "تجھ سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں" پنچایت کا بزرگ، جو نہ مسجد کا امام تھا نہ مؤذن، مگر ہر جنازے کی نماز اسی کے پیچھے ادا ہوتی تھی، ایک مرتبہ پھر دائم خان سے براہِ راست بات کرنے پر ملک شیر باز پر کڑکا "اُدھر مُنہ کر شیر باز! وہ بتا چکا ہے کہ تُو نے اس کے بھائی کو شہریوں کے کُتے کی حمایت کرنے پر پہلے گالیاں دی تھیں اور "جوڑ" اس نے اس لیے ختم کرایا کہ تُو شہری کُتے کی گردن کلہاڑی سے کٹوانے لگا تھا اور یہ ہمارے علاقے کے لوگوں کے ایمان پر لعنت بھیجنے والی بات تھی ــــ"

زندگی میں دُوسری مرتبہ میں نے جھلّے شاہ کو اس وقت دیکھا تھا جب رانگڑوں کی شادی میں نمبردار نے اپنے چھُرے سے میراثی کے ڈھول کا چمڑا چیر دیا تھا اور میراثی کا مُنہ اور ڈھول کا چمڑا ایک ہی جتنا اور ایک ہی طرح سے کھُل گیا تھا ــــ

"شادی چاہے راجپوتوں کی ہو چاہے مُغلوں کی، علاقے میں ناچ گانا نہیں ہوگا ــــ" نمبردار کی آواز غصّے کی شدّت سے یُوں ٹوٹ پھُوٹ رہی تھی جیسے اس کے گلے میں درمیان سے چِرا ہُوا کوئی بانس اٹکا ہو ــــ

سردیوں کی جیبوں میں بھر کر گھر لے جانے والی دُھوپ سارے میں پھیلی ہوئی تھی اور راجپوتوں کے کھیتوں میں گندم کی فصل نوجوان مٹیاروں کی سی تیزی سے قد نکال چُکی تھی۔ صحنوں میں بچھی سفید چادروں والی بڑی کھاٹوں پر دریا پار کے راجپوت چمکدار لباسوں پر صُوفیانہ رنگوں کے کھیسوں کی بُکلیں مارے بیٹھے تھے ــــ

"یہ ہمارے بزرگوں کا فیصلہ تھا ــــ تم ہمارے علاقے کی لڑکی بیاہ سکتے ہو مگر

ہماری باقی عورتوں میں بگاڑ مت پیدا کرو ـــــ تمہارے میراثی شجرہ بولیں مگر میں انہیں شعر نہیں پڑھنے دوں گا!"

باراتیوں کے چہرے قبروں کے چراغوں کی طرح بھڑکنے اور ماند پڑنے لگے تھے ـــــ رانا خدا بخش، نمبردار کی ٹھوڑی پکڑ کر لجلجانے لگا "خطا میری ہے چودھری میں نے انہیں یہاں کا دستور نہیں بتایا تھا ـــــ مگر اب درگزر کر ـــــ راجپوت بچے ہیں، اپنے کمیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کریں گے" ـــــ اور دولہا کے باپ نے واقعی اپنی کرسی لات مار کر الٹا دی ـــــ "یہاں کے لوگ اپنی بیٹیاں روانہ کرنا نہیں جانتے" تمام باراتی اپنی کھٹولوں سے یوں خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے جیسے دنیا کا آخری دن آ لگا ہو اور اٹھ کھڑے ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا ہو ـــــ

"اگر یہ اپنے میراثی کا منہ بند ہونے پر تیری بیٹی سے انکاری ہو جائیں تو انہیں مت روک ـــــ تو بھی راجپوت ہے ـــــ" نمبردار نے ابھی تک وہ چھرا ہاتھ سے نہیں رکھا تھا جس سے اس نے ڈھول کا چمڑا پھاڑا تھا ـــــ

قائم خاں کا "بھلا" اس دن صبح سے شادی والے گھر کے کتے کی حالت پر قہقہے لگا رہا تھا ـــــ کتے کے لئے اس دن عام دنوں سے ہٹ کر محسوس کرنا ممکن نہیں تھا اور اسی احساس کے ہاتھوں وہ انتہائی مزاحیہ صورتِ حال کا شکار ہو گیا تھا ـــــ آج اسے اجنبیوں سے عام دنوں جیسا سلوک کرنے پر صبح سے پھٹکار پڑ رہی تھی ـــــ بھانت بھانت کے مردوں اور عورتوں کو گھر میں یوں کھلے عام پھرتے دیکھ کر بار بار اس کی فطری حس بھڑک اٹھتی اور وہ بے اختیار بھونکنے لگتا جس پر گھر کا کوئی فرد فوراً اس کے کھلے ہوئے جبڑے پر لات دے مارتا یا بجھیوں پر مکے برسانے لگتا اور ہر کوئی بیک وقت اس کو لعنت ملامت کرتا۔ وہ کئی مرتبہ ایسا سلوک ہونے پر آخرکار اپنی دم دبا بیٹھا تھا مگر بارات آنے پر جب گولیاں اور پٹاخے چلے اور دریا پار والے اپنے جسموں اور لباسوں کی نا آشنا بو کے ساتھ گھر

میں داخل ہوئے تو وہ ایک دفعہ پھر بپھرنے لگا اور دولہا تو اپنے سہرے اور ہار سنگھار کے ساتھ اسے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق لگا اور اس کے نزدیک سے گذرنے پر وہ کچھ یوں خونخوار ا کہ ایک لمحے کے لئے سب ٹھٹھک گئے۔ معزز ترین مہمان کے ساتھ اس بدسلوکی پر دلہن کے بھائی نے اپنے چہیتے کو ایسی گالیاں دیں جن سے دیگیں پکانے والے نائیوں کے دل خوش ہو گئے اور ان کی مدد کرنے والی مصلّنیں یوں سر جھکا کر زور زور سے کڑچھے ہلانے لگیں جیسے اپنے کام میں انہماک کے باعث انہوں نے کچھ نہ سنا ہو۔۔۔ ایک مصلّی، جس کے ہاتھ سے کتّا عام دنوں میں اس طرح خونخوار نے پر نعمتیں کھاتا تھا، اس کے گلے میں سنگلی ڈال کر اسے بے تحاشا پیٹتا ہوا مویشیوں کے باڑے میں جا کر باندھ آیا۔ کتّے کو اپنا فرض پورا کرنے کا ایسا صلہ کبھی نہیں ملا تھا جبکہ اسے یہ بھی احساس تھا کہ گھر میں اس کی موجودگی آج سے زیادہ ضروری کبھی نہیں تھی۔۔۔

"شیخ سعدی ہوتے تو آج یہ ان سے کہتا کہ" یہ کیسے مالک ہیں جنہوں نے دروازے کھول دیئے ہیں اور کتّوں کو باندھ دیا ہے۔۔۔" جھلّا" مسلسل کتّے کی صورتِ حال سے لطف اٹھا رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔۔۔

دریا پار کے راجپوت باراتی اپنی کھونٹیاں ہاتھوں میں تھام کر کھڑے ہو چکے تھے اور زنان خانے سے ان کی عورتیں زیوروں کے کھنکنے اور ریشمی کپڑے کے سرسرانے کی آوازوں میں ڈوبی ہوئی ایک ایک کر کے نکل رہی تھیں۔ چند باراتی اپنے ساتھ آئے ہوئے بچّوں کو بلند آواز میں برا بھلا کہہ کر جمع کر رہے تھے جو مقامی بچّوں کے ساتھ چند گھنٹوں ہی میں گھل مل کر اِدھر اُدھر نکل گئے تھے۔۔۔

وہ سفید داڑھی اور بارعب چہرے والا بوڑھا جو بارات کے ساتھ آنے والے کئی قدآور جوانوں سے زیادہ مضبوط جسم کا مالک تھا نمبردار کے کندھے کو اپنے ہاتھ میں دبوچ کر اسے یوں جھنجھوڑنے لگا جیسے گہری نیند سے جگا رہا ہو" بارات گھر سے ہو کر چلی جائے تو

بیٹی ان بیاہی رہ جاتی ہے مگر کنواری نہیں رہتی ــــــ" اس چٹکلے پر نمبر دار کی آنکھیں اُبل پڑیں اور علاقے کے وہ دانگڑ جنہوں نے بارات کی آمد پہ ہوائی فائر کر کے اُس کا استقبال کیا تھا دوبارہ کارتوسوں کی پیٹیاں گلے میں ڈالنے لگے ــــ رانا خدا بخش نکاح کا رجسٹر رکھنے والے جامع مسجد کے مولوی کو اس کی واسکٹ کی جیبوں سے پکڑ کر جنونیوں کی طرح کھینچنے لگا "اس بات پر قتل فرض ہوتا ہے یا واجب ؟"

"مجھے تو کوئی یہ بتائے کہ خوشی کے موقعے پر گانا بجانا کس نے حرام بتایا ہے" جھلّے شاہ پتہ نہیں کب اور کس طرح ہنگامے کے مرکز میں نمودار ہو گیا تھا ــــ

"علاقے کی ساری برادریوں کے بزرگوں نے ......"

"کیا آپ جناب سے بڑا بزرگ بھی کسی ماں نے جنا ہے ؟"

"آپ جناب سے پہلے تو ایک خدا کی ذات ہے ــــ"

"آپ جناب نے تو خوشیوں پر "نتوں" اور میراثیوں کے ساتھ حیل دلیل نہیں کی !"

جھلّا چاروں طرف گھوم کر سوال جواب کر رہا تھا۔ اُسے یہ بھی دھیان نہیں تھا کہ اُس کے پہلے سوال کا جواب نمبردار نے دیا تھا اور دوسرے کا جواب کرڑیل جسم والے بارعب بوڑھے نے دیا تھا جو معلوم نہیں کس ناطے سے دریا پار والوں کا سربراہ تھا اور اس کے تیسرے سوال پہ مجمع کی ہلچل رُک گئی تھی ــــ سوائے میراثیوں اور نتوں کے جو مویشیوں کے باڑے سے ٹیک لگا کر کھڑے تھے اور جن کی آنکھیں پہلے جھلّے شاہ کی آمد اور اس کے سوالوں پر حیرت سے پھیل گئی تھیں اور اب ان کے سر مسرّت اور تائید میں ہلنے لگے تھے۔

فضا کی سانس رُکنے سے شادی والے گھر کے کُتے کی آواز اچانک سُنائی دینے لگی جو اب تھکن سے خرخراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی ــــ

"تم نے حیوان کو اپنا فرض پورا کرنے پر مارا اور اپنا کام کرنے پر میراثیوں کا ڈھول پھاڑا" جھلّے شاہ کا رُخ اب نمبردار اور رانا خدا بخش کی طرف ہو گیا تھا ــــ

"مگر ناچ گانے سے آپ جناب نے پناہ مانگی ہے" رجسٹر بردار مولوی کا نائب بڑی گہری سوچ سے نکل کر اچانک اس کی پشت سے پہلی بار بولا تھا ——

"اپنے لئے —! اپنے لئے قاضی صاحب —! غیر علاقے والوں کو ان کے رواجوں پر نہیں ٹوکا — مدینے والوں کو نہیں روکا —! میں کتابوں سے ثابت کروں گا"

سب اپنے قدموں پر لڑکھڑا کر رہ گئے — کتابیں تو جھلے شاہ سے زیادہ ہائی اسکول کی لائبریری میں بھی نہیں تھیں — کتابوں کی بات درمیان میں آنے پر تحصیلدار اور پٹواری جھلّے شاہ سے زمین کی تقسیم کے مسئلوں پر گفتگو کرنا بند کر دیتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ وہ بدحواس ہی کتابیں پڑھ پڑھ کر ہوا ہے ——

"اگر وہ اُلٹی سیدھی کتابیں نہ پڑھتا تو کیسے ممکن تھا کہ مُلے مسائل تو سب سے زیادہ بیان کرتا اور نماز ایک بھی نہ پڑھتا" دائم خان اکثر افسوس سے سر ہلا کر اُس کے بارے میں کہا کرتا تھا ——

"یہ صحیح کہتا ہے!" تحصیل کی جامع مسجد کے مولوی نے جو نکاح کا رجسٹر رکھنے کے علاوہ نماز جمعہ کے خطیب بھی تھے، آخر سب کو مار ڈالنے پر تلی ہوئی خاموشی کو توڑا "آپ جناب ہر علاقے کے رواجوں کی قدر کرتے تھے ——"

جب ڈولی روانہ ہوئی تو اس نے دُلہن کے سر پر بڑے بھائیوں کی طرح ہاتھ پھیرا اور آنسوؤں کے نمودار ہونے سے پہلے تیزی سے سُرخ ہوتی ہوئی آنکھوں سے کہا "غیر علاقے کٹھن ہوتے ہیں ——"

تیسری اور آخری مرتبہ میں نے جھلّے شاہ کو اُس وقت دیکھا تھا جب دائم خان میرے باپ کو زمین پر خون میں لت پت اور ہانپتا ہوا چھوڑ کر الگ ہو گیا تھا اور اب جھلّے پر لاتیں، مُکّے اور لاٹھیاں برسا رہا تھا ——

"تُو نے باپ کی قبر گُم کر دی —! میں تجھے اس لئے پیچھے چھوڑ گیا تھا کہ تُو اپنے

باپ کو ناپید کر دے! ہمارے نام کا خاتمہ کر دے!" دائم خان اپنے بھائی کے تمام جسم کو گاؤں کے سارے زمینداروں اور مزارعوں کے سامنے انتہائی بیدردی سے زخماتے ہوئے قبرستان کے املی کے درختوں والے حصے میں لے گیا ـــــ "تمام مٹی چاٹ جا اور باپ کا مردہ نکال! تیرے ہوتے ہوئے قائم خان کی قبر بیٹھ گئی، اس کا پتہ گم ہو گیا ـــــ"

جھلے شاہ نے ایک بار بھی اپنے بھائی کی لاٹھی پکڑنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کے ٹھڈوں سے اپنا چہرہ بچایا تھا ـــــ

جب دائم خان دُہرے قتل پر کئی زمانوں کے لئے جیل چلا گیا تھا تو جھلے نے گھر سے نکلنا بے حد کم کر دیا تھا ـــــ دو تین سال تک تو ہر محرم میں اس کی لنگڑی بھابی گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ اپنے ان عزیزوں کی قبریں درست کرنے آتی رہی جن کے جنازوں پر رونے والے بھی اُسی جہان روانہ ہو چکے تھے، اور اپنے خاوند کے باپ کی قبر پر لیپا پوتی کرتی رہی مگر جب وہ خود پیٹ کا پھوڑا پھٹنے سے اپنی زمینوں کے منشی سے حساب لیتے لیتے اچانک گر کر مر گئی تو مسلسل کئی عاشورے ایسے گذر گئے جب قائم خان کی قبر پر لپائی کرنے کوئی نہیں آیا اور ہر ساون میں اس کی قبر کی مٹی بہتی رہی اور حد بندی مٹتی رہی۔

جب دائم خان خود موت کے نزدیک آ لگنے پر چھوٹ کر آیا تو اُس کے باپ کی قبر کے آس پاس کی ساری زمین برابر ہو چکی تھی۔ قبرستان کے اس علاقے میں گڑھے پڑ گئے تھے اور وہاں بارش کا پانی جمع ہو جاتا تھا اور کائی نمودار ہو گئی تھی اور آری کی طرح کھال کاٹ دینے والی شاخیں رکھنے والی جنگلی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں جن کے کانٹوں کی شکل والے پتوں پر گرگٹ پھرتے تھے اور جڑوں سے سانڈے مکروہ چہرے نکال کر جھانکتے تھے، اور بیری کے بوٹے تھے جنہیں دن بھر بکریاں چرتی رہتی تھیں اور املی کے درخت تھے جن پہ بچہ لیوں کے دکھوالے بے موسمے پتھر بھی پھینکتے تھے۔

"ہر محرم میں لپائی نہیں کروا سکتا تھا تو پکی کروا دیتا! تو جھلا اور میں بے اولاد!

اور تُو نے ہمارا پچھلا نشان بھی مٹا دیا ـــــ " دائم خان اب جس آواز میں بول رہا تھا اس سے زیادہ دہلا دینے والی آواز پھر کبھی سُننے میں نہیں آئی۔

اس واقعے کے بعد میں نے جھلّے شاہ کو اپنی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا۔ دائم خان تو جیل سے چھُوٹنے کے کچھ عرصے بعد سردیوں کی ایک رات الاؤ سے اچانک اُٹھ کر گھر کے لئے نکل کھڑا ہُوا اور راستے میں ہی ٹھنڈا گرم ہو کر مر گیا۔ میں لڑکپن کے تجسّس میں صرف جھلّے شاہ کا دیدار کرنے اس بلا کی سردی میں ٹھنڈے پانی سے نہا کر اس کی نماز پر پہنچ گیا اور تدفین تک ساتھ رہا مگر وہاں لوگوں سے سُنا کہ "جھلّے کا دماغ اب مکمّل طور پر ناکارہ ہو چکا ہے۔ اس نے نیچ ذات کے لوگوں سے میل جول بڑھا لیا ہے اور انہیں عجیب عجیب سبق پڑھاتا ہے، اور پُرانی چیزوں کا دیدار کراتا ہے ـــــ"

میرا باپ عرصے تک اس کے پاس جاتا رہا اور جب میری ماں سبب پوچھتی تو وہ بھنگ کے نشے میں اکثر کسی قبر کے اُوپر لیٹے لیٹے اس کے بارے میں کہتا "بہت باریک باتیں کرتا ہے"۔

وہ جیٹھ ہاڑ کا موسم تھا، جب سارا دن ہَوا سانس روک کر گھات میں بیٹھی رہتی ہے اور پھر بے خبری میں حملہ آور ہوتی ہے اور شور مچاتی ہے اور دُھول اُڑاتی ہے اور تباہی پھیلاتی ہے۔ اس موسم میں قبرستان رہائشی جگہ کے طور پر بہت غیر محفوظ ہوتے ہیں اور گورکنوں کو جان اور املاک اور ڈھور ڈنگروں کی سخت فکر لگی رہتی ہے۔ اگر جڑوں سے اکھڑ کر سروں پر آ گرنے والے درختوں کے خطرے سے نجات مل جائے تو کچھ دیر بعد ژالہ باری شروع ہو جاتی ہے جس کے بارے میں پہلی کے قاعدے میں یہ نہیں لکھا کہ وہ چھتوں کو بٹھا دیتی ہے اور ڈنگروں پر گولیوں کی طرح برستی ہے اور بعض اوقات اولے اُن کے پھُولے ہُوئے مُردہ جسموں میں بھی سوراخ کر دیتے ہیں۔

جیٹھ ہاڑ کی ایک ایسی ہی طوفانی رات میں میرا باپ کیچڑ سے لت پت گھر آیا اور گینتیاں بیلچے میرے کندھوں پر رکھ کر قبرستان کے املی کے درختوں اور بیری کی جھاڑیوں والے

حقے کی طرف روانہ ہوگیا جہاں چند دُوسری چھوٹی ذاتوں کے لوگ پہلے سے موجود تھے۔ ہم نے یُونہی سا ایک گڑھا کھود کر اسے قبر کی شکل میں بند کر دیا۔ بعد میں میراثیوں نے رات کی بارش کا زور توڑنے کے لئے اس پر ایک وقتی سائبان کھڑا کر دیا گھر لوٹتے ہوئے راستے میں میرے باپ نے اچانک مجھے اُٹھا کر ایک کچّی قبر پر پٹخ دیا اور میرے سینے پر سوار ہو کے قبر کی گیلی مٹّی سے مٹھیاں بھر کر میرا مُنہ بند کرنے لگا ——

"جھلّے شاہ وصیّت کر گیا تھا کہ اس کی لاش پانی میں بہادی جائے" وہ میرے کان کو دانتوں سے چھیلتے ہوئے بولا، —— "مگر ہمیں اس نے اپنی نشانی رکھنے سے نہیں روکا تھا۔ تیری ماں کو بھی نہ پتہ چلے ——"

ایک بار جھلّے شاہ کے "سالانے" سے لوٹتے ہوئے میں نے اپنے مرحُوم باپ سے کہا تھا کہ "اب جب کہ علاقے کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی عُرس بن گیا ہے تو گاؤں والے باخبر ہو کر بھی رازداری کیوں نہیں برتیں گے ؟" اس بات پر وہ پھر مجھے ایک قبر پر پچھاڑ کر میرے سینے پر بیٹھ گیا تھا اور ہر چند کہ اب اس میں پہلے والا دم نہیں رہا تھا اُس نے پھر میرے کانوں کو کاٹا تھا، "لوگ کچھ نہیں سمجھتے" اُس نے اپنے کھُردرے ہاتھوں سے میرے ہونٹ چھیل دیئے تھے، اور قبر کی مٹّی میرے مُنہ میں بھر کر بولا تھا "جھلّے شاہ ہمیشہ کہتا تھا، عام لوگ کچھ نہیں سمجھتے ——!"




پیوند

"اگر پہاڑی بکری جھاڑ جھنکار چرتے ہُوئے سانپ نگل جائے تو تیسرے دن اُس کے مُنہ سے جھاگ نکلتی ہے۔ اسی جھاگ کا ایک قطرہ سُوکھ کر "منکا" بن جاتا ہے جو زہر چُوس کا کام دیتا ہے۔"

پہلے نے کہا ــــــ

"صرف بکری کیوں ؟ گائے بھینسوں کے ساتھ بھی یہی ہوگا ــــــ"

دُوسرا بولا ــــــ

پہلا ہنس دیا ــــــ "زہریلی چیزیں ہضم کرنے کی اہلیت بکری سے زیادہ کوئی مویشی نہیں رکھتا۔ عام سی بات ہے مگر تم نہیں جانتے ــــــ"

دُوسرے کا جی چاہا کہ وہ پہلے کی گردن اس طرح دبائے جیسے اُس نے کچھ دیر پہلے سانپ کی گردن پر زور ڈال کر اُس کا مُنہ کھول دیا تھا اور اُس کے زہر والے اور خوراک کے دانتوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کی وضاحت کی تھی اور پھر اُس کی کھوپڑی پتھروں پر رگڑ رگڑ کر اُسے چُوہے کی موت مار دیا تھا۔

"لیکن" دُوسرے نے سوچا۔ "اُس نے سانپ کے مُنہ پر ریشمی رُومال پھینک دیا تھا جس پر ڈنک مار کر وہ دانت اُلجھ جانے کے سبب بے بس ہوگیا تھا ــــــ میں اِس کے ساتھ

کیا کروں ـــــ؟

"گیدڑوں کے سردار کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں سفید گیدڑ کے ماتھے میں رسولی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی کو گیدڑ سنگی کہتے ہیں ـــــ"

پہلے نے سانپ کو اُس وقت ہلاک کیا تھا جب دُوسرا خوف کی شدت سے اپنے گھٹنوں پر بیٹھ چکا تھا۔ اس لئے اب وہ اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے مسلسل بول رہا تھا۔

"اگر کہیں سے بوٹی مل جاتی تو مارنے کے بجائے اُس کے دانت کھٹے کر کے جیب میں ڈال لیتا۔"

اُس نے مُردہ سانپ کو اپنے بوٹ سے مسلتے ہوئے لاپرواہی سے بات جاری رکھی۔

"تُم سپیرے کی اولاد ہو ـــــ" دُوسرے نے اپنے طیش اور جھنجلاہٹ کی بہ نسبت بہت ہلکی بات کہی تھی۔

"جتنے دن ہم نے لمبی گلی میں گذارے، مجھے تُم دتّے کے بچّے لگتے رہے۔"

دُوسرے کے دھیان میں اُس کے پنج وقتہ نمازی باپ کا چہرہ آ گیا جس کی نسبت پہلے نے یہ بات کہی تھی اور وہ اپنے حلق سے ایک غیر انسانی آواز برآمد کر کے پہلے کا مُنہ نوچنے لگا۔

اس سے قبل وہ ایک مرتبہ لمبی گلی میں ہاتھا پائی کر چکے تھے۔

کچہری سے فرار ہونے کے بعد انہوں نے طے شدہ منصوبے کے تحت بائی جی کے گھر پناہ حاصل کی تھی۔ "دُوسرا" جیل جانے سے قبل بائی جی اور اُن کی نوچیوں کو سر سے پاؤں تک چوری کے زیورات سے لاد چکا تھا اور گرفتار ہونے پر بدن کے سارے ناخن اور بال کھنچوا دینے کے باوجود اُس نے پولیس کو مسروقہ سامان کی برآمد کے سلسلے میں لمبی گلی کا رُخ نہیں کرنے دیا تھا۔

جب وہ مفروری کے بعد بائی جی کے دربار میں اچانک حاضر ہُوا تو اُسے دیکھ کر بائی جی کا جلالی چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور خوف سے اُن کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

"بائی جی جگرے والی عورت ہے۔" بعد میں "دُوسرے" نے "پہلے" کو بتایا تھا ـــــ "اگر میں

اکیلا ہوتا تو کبھی نہ ڈرتی۔ لیکن نئے آدمی کو ساتھ بندھے دیکھ کر بڑا بڑا جوان گھبرا جاتا ہے۔"

مگر "دوسرے" نے وہیں کھڑے کھڑے بائی جی کا خوف اور شک و شبہ دور کر دیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ دُہری ہتھکڑی میں اس کے ساتھ بندھا ہوا شخص دیہاتی علاقوں کا مشہور و معروف اور انتہائی چابکدست نقب زن ہے اور یہ کہ جیل میں انہوں نے بھائی بندی کی قسم کھائی تھی اور ایک دوسرے کے سہارے بہت اچھا وقت گذارا تھا۔

بائی جی نے انہیں تماش بینوں کی نظروں سے بچانے کے لئے گلی کے پچھلے رُخ پر واقع صندوقوں اور بکسوں سے بھرے ہوئے ایک نیم تاریک اور سیلن زدہ کمرے میں گھسا دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ ہتھکڑی کاٹنے کے لئے وہ بہت جلد کسی اعتبار والے کاریگر کا انتظام کرے گی۔

چند دنوں تک وہ بکسے کھول کر رنڈیوں کے پرانے فیشن کے رنگ برنگے کپڑے نکال کر اُن کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے اور لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے صندوقوں کے مُنہ کھول کر گرمیوں کے ایام میں بیکار ہو جانے والی ریشمی رضائیاں اور سویٹریں نکال لی تھیں۔ جو مہینوں بعد بھی شہوت انگیز خوشبوؤں سے لبریز تھیں، اور اُن سے لپٹ کر خود کو تفریح مہیا کی تھی اور خوش وقت ہوئے تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ ایک دن تاریک کونوں کھدروں میں پڑے ٹوٹے پھوٹے گھنگروؤں سے باندھ کر ناچنے لگے تھے جس پر بائی جی بغیر دوپٹہ اوڑھے نیم تاریک اور سیلن زدہ اسٹور روم میں دوڑی چلی آئی تھیں اور انہیں ہوش میں آنے کی ہدایت کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر یقین دلایا تھا کہ ہتھکڑی کاٹنے والے قابلِ اعتبار کاریگر کی آمد بس ایک دو دن کی بات تھی۔

اُس نیم تاریک کوٹھڑی میں از خود "دوسرے" کی بالادستی قائم ہو گئی تھی کیونکہ پناہ دینے والی اُس کی شناسا اور زیر بارِ احسان تھی اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ "پہلا" قصبات اور دیہاتوں کا وارداتی تھا اور اُس ماحول سے قطعی نا آشنا تھا جس میں "دوسرا" اور وہ مفروری کے دن کاٹ رہے تھے۔ "دوسرے" نے اُسے عورتوں اور مردوں کی ڈیل ڈول اور عادات و اطوار کے لحاظ سے مختلف اقسام سمجھائی تھیں اور اپنے بارے میں اعلیٰ ترین کوک شاستری مرد ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور بائی جی کی اُس نوچی کو اپنا جوڑ

بتایا تھا جسے دیکھ کر "پہلے" نے حیرت سے سوچا تھا کہ آخر اس قدر بھرے ہوئے جسم کو اتنے نازک پاؤں کیسے سنبھال لیتے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ اُس کے دل میں اُسے رقص کرتے ہوئے دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی تھی۔

ایک رات وہ خاموش بیٹھے مکان کی بیٹھک سے آنے والی ناچ گانے کی آوازیں سُن رہے تھے کہ "پہلے" نے اچانک "دُوسرے" کو مخاطب کر کے کہا تھا: ——— "جیل میں تم کہا کرتے تھے کہ رنڈیوں میں تمہاری بڑی عزت ہے۔" ———

"تو یہ کیا تم اپنی ماں کے گھر بیٹھے ہو؟" ——— اُس روز "دُوسرے" نے نرم بات کا جواب تلخی سے دیا تھا اور نتیجتاً وہ دونوں پہلی مرتبہ ایک دُوسرے کا سر پھاڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ بات دست و گریباں ہونے سے آگے بڑھ کر خون خرابے تک پہنچتی بائی جی اور اُن دونوں نسوانی تکلیف میں مبتلا ہونے کے باعث گھر کے پچھلے کمرے میں آرام کرنے والی ایک نوچی بیچ بچاؤ کے لئے پہنچ گئی تھیں ———

اُس رات سونے کے لئے بڑے صندوق پر بستر بچھاتے ہوئے "پہلے" نے کہا تھا: ——— "دوبارہ گرفتار ہو گئے تو جیل میں کھولی بھی نہیں ملے گی ——— بند وارڈ میں ڈال دیئے جائیں گے ——— الگ الگ۔ مفروروں کی سزا پتہ ہے؟" ——— "دُوسرے" نے خوف سے زرد ہوتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا ———

اگلے دن وہ تمام وقت شدید جھنجھلاہٹ کا شکار رہے تھے۔ "پہلے" کا جی چاہا کہ جیل کی طرح کوئی اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو اور دیر تک سونے پر گالیاں دیتے ہوئے اُسے کھاد کے ٹوکرے ڈھونے کے لئے لے جائے۔ اُسے یاد آیا کہ فضلے کی بنی ہوئی کھاد سے اکثر جوئیں اُبل پڑتی تھیں اور بعض اوقات جسم کے کسی حصے کی خارش دُور کرنے کے لئے لاشعوری طور پر ہاتھ بڑھایا جاتا تو انگلیوں سے کوئی جونک لپٹی چلی آتی اور وہ اپنی اُبکائیاں روکنے کی خاطر پاک صاف چیزوں کو دھیان میں لاتا تھا۔ ایک مرتبہ تو جونک اُس کی پنڈلی سے اس طرح لپٹی کہ کھینچے جانے پر

لمبی ہوتی چلی گئی لیکن آگ نہیں ہوئی۔ آخر اُسے حوالدار کا سُلگتا ہُوا سگریٹ لگایا گیا اور جب اُس نے وہ سگریٹ واپس کیا تو حوالدار نے ڈنڈا اُس کے ہاتھ پر مار کر کہا تھا ـــــ "یہ غلاظت اب تیرا باپ پیئے گا؟" فوراً کئی قیدی اُس سگریٹ پر جھپٹ پڑے تھے اور وہ متلاہٹ پر قابُو پانے کے لئے سینہ تھام کر دُہرا ہوگیا تھا۔ وہ اس طرح کا کام کرتے ہوئے ایک ایک لمحہ گن گن کر کاٹتا اور اس خیال سے خوش ہوتا کہ شام کو "دُوسرے" سے ملاقات ہوگی، جس سے اس کی شناسائی کی مُدّت چند مہینوں سے زیادہ نہیں تھی مگر وہ اس مختصر عرصے میں ایک دُوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ بیگار پر جاتے ہوئے "دُوسرا" اکثر اُس سے کہتا ـــــ "اگر سبزیوں کے باغ میں کتے خصّی کرنے کے لئے یہ حرام زادے تجھے بھی میرے ساتھ بھیج دیں تو اُن کا کچھ نہیں بگڑتا۔ مگر ہمارا وقت تو چُٹکیاں بجاتے گزرے گا۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟" "دُوسرے" کے دل میں طویل خاموشی سے ہول اُٹھنے لگا تھا۔

"تمہیں یاد ہے ـــ" "پہلے" نے کہا ـــــ "جیل میں جب وہ ہمیں الگ الگ بیگار پر لے جاتے تھے تو ہم دل میں انہیں کتنی گالیاں دیتے تھے۔"

"ہاں ـــ"

"اور آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ کہیں جا کر گندگی کے ڈھیر اُٹھاؤں" ـــــ

"اصل میں ـــ" "دُوسرا" دہشت زدہ ہو کر بولا تھا ـــــ "تمہیں یہ خیال اس لئے آیا کہ ہم یہاں بھی قید ہو گئے ہیں۔" اور "پہلے" نے فوراً اُس سے اتفاق کا اظہار کیا تھا۔

"تو تم بائی جی سے اجازت مانگو ـــــ اتنے دنوں میں تو میں اپنے گاؤں کے لوہار سے یہ کام کرا سکتا تھا ـــ اور پھر جب تک کام نہیں ہوتا کم از کم کھلے علاقے میں آزادی سے تو رہیں گے۔"

بائی جی نے انہیں رخصت کرتے ہوئے اپنے پیشے کے آداب کے مطابق انتہائی معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا تھا ـــــ "تم جانتے ہو کاریگر کے ذریعے بات نکل سکتی تھی ـــ کتنا اعتباری آدمی چاہیئے ـــ دوبارہ پکڑے گئے تو ـــــ؟"

"ہاں — ہاں — جانتا ہوں —" "دوسرے" نے انتہائی غضبناک لہجے میں بائی جی کی بات کاٹی تھی — "اگر دوبارہ پکڑے گئے تو وہ تیری ماں کے شوقین ہمیں بند وارڈ میں ڈال دیں گے۔ الگ الگ —"

ایک لمحے کے لئے بائی جی کی حالت یوں ہو گئی تھی جیسے کوئی خانہ دار عورت گھر کا کام کاج کرتے ہوئے نادانستگی میں کسی چھپکلی کے بالکل سامنے آ گئی ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُن کے چہرے سے تمام حیرت اور خوف اور کراہت دُور ہو گئی تھی اور انہوں نے عجیب طرح سے مسکراتے ہوئے کہا تھا — "تمہارے غصّے سے پتہ چلتا ہے کہ تم کتنے خوف زدہ ہو" — اور "پہلا" بائی جی کی مردم شناسی پر حیرت سے منہ کھول کر انہیں دیکھنے لگا تھا —

لمبی گلی سے نکل کر انہوں نے تین دن آرام اور تین راتیں مسلسل سفر کیا تھا۔ اُن کی منزل اب دُوسرے ضلعے کی آخری تحصیل کا ایک دُور اُفتادہ اور گمنام سا گاؤں تھا۔ یہ ضلعوں اور تحصیلوں کا چکر بھی "پہلے" نے "دُوسرے" کو سمجھایا تھا — اور یہیں سے "پہلے" کی رہبری اور برتری کی ابتدا ہوئی تھی — وہ جُوں جُوں بڑے شہر سے دُور ہوتے گئے تھے، "دُوسرا" کمزور پڑتا گیا تھا۔ اُس کی یہ کمزوری رُوحانی اور جسمانی سطحوں پر واضح ہوتی چلی گئی تھی۔ اُس نے ابتدا میں یہ حساب رکھا تھا کہ وہ اب کس تھانے کی حدُود سے نکل کر کس تھانے کی عملداری میں داخل ہو گئے ہیں لیکن آہستہ آہستہ اُس کے نیچے کی زمین اور اُوپر کے آسمان کا رنگ بدلتا گیا تھا اور اُس کے ساتھ ہی تھانوں کے نام قرب و جوار کے علاقوں کی طرح اجنبی اور نامانوس ہوتے گئے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کونسی جھاڑی کے خوفناک شکل و صورت کے پھلوں میں لذیذ اور بے ضرر رس موجود ہے اور کس معصوم اور گھریلو نظر آتے والے درخت میں زہریلا مادہ پایا جاتا ہے۔ اُسے خوفناک طریقے سے سَر کے اُوپر جھکی ہوئی چٹانوں کے سائے میں سونے کا کوئی تجربہ نہیں تھا جبکہ "پہلا" جو وارداتوں کے بعد ہمیشہ جنگلوں میں رُوپوش ہو جاتا تھا ایسی جگہوں پر بیٹھنے کے چند لمحوں بعد مُنہ کھول کر خراٹے لینے لگتا تھا جس سے "دُوسرے" کو بڑی وحشت ہوتی تھی — اب اُسے اس

بات میں بھی "پہلے" کی سازش نظر آتی تھی کہ اُس نے معذوری والے دن عدالت میں پیشی کے لئے روانہ ہوتے ہوئے مشترکہ ہتھکڑی میں اپنا بایاں بازو ڈالا تھا اور دایاں آزاد رکھا تھا جب کہ "دوسرے" کو اپنا دایاں بازو قابو کرانا پڑا تھا۔۔۔

یہی وجہ تھی کہ چھوٹی موٹی جھڑپوں میں "پہلا" فوراً اپنا طاقتور دایاں بازو استعمال کر کے "دوسرے" کو اس طرح دبوچ لیتا تھا کہ اُس کے لئے سانس لینا دشوار ہو جاتا تھا۔۔۔

جب وہ رات کی تاریکی میں شہر کی حدود سے باہر نکلے تھے تو "پہلا" خوشی سے بے قابو ہو کر اپنی غیر متوازن آواز میں کوئی دیہاتی گیت گانے لگا تھا جو "دوسرے" کی سماعت پر مسلسل خراشیں ڈالتا رہا تھا۔۔۔ ویرانے میں داخل ہوتے ہی "پہلے" کو دو طرح کی آزادیوں کا بیک ساعت احساس ہوا تھا۔۔۔ یہ کہ وہ بائی جی کی کال کوٹھڑی سے نکل آئے تھے اور یہ کہ شہر کی فضا سے نکلتے ہی وہ "دوسرے" کی بالادستی کے حصار سے بھی رہا ہو گیا تھا۔۔۔ اُس نے صبح تک جنگلوں اور بیابانوں میں اپنی سابقہ روپوشیوں اور پولیس مقابلوں کی داستانیں ایسے لہجے میں بیان کی تھیں جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ "دوسرے" کے ماضی کو اپنے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ دراصل وہ کچہری سے فرار ہوتے ہی ایک ایسے ماحول میں داخل ہو گیا تھا جس کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ "دوسرے" کے مقابلے میں ناچیز ہوتا چلا گیا تھا۔۔۔ اور اب اپنی جانی پہچانی فضاؤں میں سانس لیتے ہی وہ بائی جی کے گھر میں گزارے ہوئے چند دنوں کے ردِ عمل میں لاشعوری طور پر پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔۔۔ اُس نے "دوسرے" کو اُس علاقے کی بولیوں اور وہاں کے لوگوں کی عادات و اطوار کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔۔۔ "دوسرا" جانتا تھا کہ "پہلا" یہ سب کچھ نیک نیتی سے ہرگز نہیں بتا رہا بلکہ اُسے متاثر اور مرعوب کرنا چاہتا ہے لیکن اب وہ ایسے دشوار گزار علاقوں اور پُر پیچ راستوں میں پھنس چکا تھا جہاں سے شہر لوٹنے کے لئے بھی اُسے "پہلے" کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔۔۔ اس لئے وہ "دوسرے" کی مبالغہ آمیز باتیں سنتا رہتا اور تائید میں سر ہلاتے ہوئے اکثر سوچتا کہ آخر وہ کون سی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر "پہلا"

جیل کی چند دنوں کی رفاقت کے دوران آسے اتنا عزیز ہوگیا تھا کہ جج کو جیکار پر جانے کے لئے اُس سے جُدا ہوتے وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے ــــ اور آخر کار انہوں نے ایک دُوسرے کا مُستقل قُرب حاصل کرنے کے لئے فرار کا منصُوبہ بنایا تھا اور بھائی بندی کی قسمیں کھائی تھیں ــــ

مُسلسل سفر اور کم خوراکی کے باعث اُن کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور چہرے کی ہڈیاں خوفناک انداز میں اُبھرنا شروع ہوگئی تھیں ــ بائی جی کے عطا کردہ کپڑوں کے جوڑے جگہ جگہ سے اُدھڑ گئے تھے اور اب اُن کا واحد سہارا وہ چادر تھی جو دن کے وقت مشترکہ ہتھکڑی چُھپانے کے کام آتی اور رات کو مچھروں اور دُوسرے زہریلے کیڑوں مکوڑوں کے خلاف مضبوط دفاع ثابت ہوتی ــــ انہیں اپنی اُجڑی ہوئی حالت کا علم دُوسرے کے سراپے پر نگاہ ڈالنے سے ہوتا تھا ــ اس لئے اب وہ ایک دُوسرے کو نظر بھر کر دیکھنے سے بچتے تھے ــــ

"اگر یہ ہتھکڑی نہ ہوتی تو میں کہیں جاکر داڑھی مُنڈاتا اور خوب صابن مل مل کر نہاتا ــــ"

ایک دن "پہلے" نے "دُوسرے" کو دیکھ کر کہا تھا ــــ

"اور میں کہیں جاکر پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ــ" "دُوسرے" نے "پہلے" کی جلی ہُوئی رنگت اور ڈھانچہ بنے ہُوئے وجُود پر نظر ڈالتے ہُوئے جواب دیا تھا ــــ

"ہتھکڑی نہ ہوتی تو تم دیکھتے میں کیا کرتا ــ"

"ہتھکڑی نہ ہوتی تو میں تمہیں کیوں دیکھتا ــــ خود کسی دھندے سے نہ لگا ہوتا ــ"

"پہلا" خاموش ہوگیا تھا ــــ اس لئے کہ وہ اب خود میں لڑنے کی کوئی خواہش نہیں پاتا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ شہر کی فضا سے نکل کر جیسے جیسے "دُوسرے" کی کمزوریاں نمایاں ہوتی گئی تھیں وہ اُسی حساب سے چڑچڑا اور کٹکھنا ہوتا چلا گیا تھا ــــ یہ اور بات تھی کہ "پہلے" کا دایاں بازو آزاد تھا اور اُسی کی مدد سے وہ چھوٹتے ہی "دُوسرے" کو قابُو کرلیتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ "دُوسرے" کے بتدریج تُند ہوتے ہُوئے جارحانہ رویّے سے تشویش میں مُبتلا ہوگیا تھا اور اب

شاذ و نادر ہی کوئی ایسی بات کرتا تھا جس سے دوسرے کو مزید [illegible] ملے ـــــ وہ نہیں چاہتا تھا کہ "دوسرے" کی ذہنی کیفیت اس حد تک ابتر ہو جائے کہ وہ کسی نازک جگہ پر چیخ و پکار کر کے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لے ـــــ دوبارہ گرفتار ہونے کی صورت میں مجرموں کو سزا کے طور پر تنہا قید کر دیا جاتا تھا اور جیل میں مشہور تھا کہ چند ہفتوں تک اکیلا بند ہو جانے والا مجرم بہت کم اپنی کھولی میں بقائمی ہوش و حواس واپس آتا تھا ـــــ "پہلا" ماضی میں کئی مرتبہ سزائیں کاٹ چکا تھا مگر بند وارڈ سے جیل کے پاگل خانے میں منتقل ہونے کے بارے میں سوچ کر اُس کے پاؤں تلے کی زمین نکل جاتی تھی ـــــ

ہر چند کہ وہ "دوسرے" کے مقابلے میں بہتر حالت میں تھا لیکن آج اُس نے دیہاتی زندگی کے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک انتہائی ضرر رساں سانپ کو آسانی سے ہلاک کر دینے پر "دوسرے" سے داد طلب کی تھی، جس پر "دوسرے" نے اُسے "سپیرے کی اولاد" کہا تھا اور یہ ایک ایسی کمینی بات تھی کہ جواب میں اُسے بھی تلخ ہونا پڑا تھا ـــــ

نتیجتاً وہ بہت شدّت سے لڑ پڑے تھے اور آج دُور دُور تک کوئی بیچ بچاؤ کرانے والا نہیں تھا ـــــ

پہلی مرتبہ اُن کے درمیان بائی جی کے گھر کی کوٹھڑی میں زور آوری ہوئی تھی لیکن اُس کے بعد ہمیشہ معاملہ نوچ کھسوٹ اور چھینا جھپٹی تک محدود رہا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ناہموار راستوں پر چلتے ہوئے "دوسرا" عموماً زیادہ تھک جاتا تھا اور آزاد دائیں بازو کے ساتھ "پہلے" کے لئے اُسے فوراً زیر کر لینا کوئی مسئلہ نہیں تھا ـــــ لیکن آج "دوسرے" نے لڑائی کو کشتی میں تبدیل نہیں ہونے دیا تھا بلکہ ابتدا ہی سے دست بدست لڑائی کے اصول برتے تھے ـــــ اور "اسٹریٹ فائٹنگ" میں اُس کا تجربہ بے حد وسیع تھا ـــــ

اس سے قبل کہ "پہلا" اُس سے گتھم گتھا ہوتا، "دوسرے" نے اپنے آزاد بائیں پنجے سے اس کے سر کے بالوں کی گرفت لے کر پوری طاقت سے جھٹکا دیا جس کی وجہ سے وہ ایک لمحے

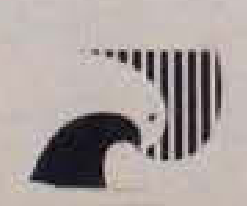
کے لئے آگے کو جُھک گیا اور اس سے قبل کہ "پہلا" رکوع کی حالت سے واپس پلٹتا "دُوسرے" کے گھٹنوں کی ضربیں اُس کے ہونٹوں اور آنکھوں کو مسخ کر گئیں اور وہ چکراتے ہوئے سر کے ساتھ مزید آگے کو بل کھا گیا ـــ "پہلے" کے چہرے کو خون آلود ہوتے دیکھ کر "دُوسرے" کا غصّہ وحشت میں تبدیل ہوتا گیا اور اُس نے یکے بعد دیگرے دایاں بایاں گھٹنا چلانے کے بجائے بیک ساعت دونوں گھٹنوں سے اُس کے چہرے کو ضربیں لگانی شروع کر دیں ـــ چند ہی لمحوں میں "پہلا" نیم جان ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گیا اور اپنی کٹی پھٹی آنکھوں سے "دُوسرے" کو یوں دیکھنے لگا جیسے چوزوں والی مُرغی دُور کہیں نیلی فضاؤں میں مکاری سے چکّر لگاتی ہوئی چیل کو دیکھتی ہے ـــ

"دُوسرے" نے پہلی مرتبہ مُکمّل فراغت کے ساتھ اپنے حریف کے لرزتے ہوئے وجُود کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اُس کے دل میں ایک وحشی خیال نے جنم لیا ـــ اور ٹھیک اُسی لمحے "پہلا" پیشہ ور چوروں کی مخصوص حسّیات کے ذریعے اُس کے خیال کو بھانپتے ہوئے بھیانک آواز میں چیخا ـــ "نہیں ! نہیں ! اس طرح مت کرنا ـــ ہم دونوں آج ہی آزاد ہو سکتے ہیں ـــ"

اور "دُوسرے" نے ہاتھ میں اُٹھایا ہُوا نوکیلا پتھر پرے پھینک دیا ـــ

شام ڈھلے جب وہ اُس دُور افتادہ چوکی میں داخل ہُوئے تو سپاہیوں نے اپنی ہانڈی سے حصّہ دے کر اُنہیں بولنے کے قابل بنایا ـــ بیانات تحریر کروانے کے بعد جونہی انہوں نے علیحدہ علیحدہ بند کئے جانے کی درخواست کی، چوکی کے انچارج نے اُنہیں حوالات کے آہنی دروازے کے اندر دھکیلتے ہُوئے کہا ـــ

"تُم ڈسٹرکٹ جیل کے مفرُور ہو ـــ تمہاری ہتھکڑی کی چابی سے ہمارا کیا تعلّق ہے ؟"





جس درخت کے نیچے یا اندسوہ بیٹھا اور سویا کرتا وہ ایک بوڑھا درخت تھا —— بلکہ اس درخت کو دیکھ کر لفظ 'قدیم' ذہن میں اُبھرتا تھا —— برگد کی قسم کے اس درخت کی شاخوں اور تنے میں بوڑھے انسانوں کی ٹانگوں میں اُبھرنے والی رگوں جیسے اُبھار تھے —— وقت گذرنے کے ساتھ نمو کی قوتیں کمزور پڑنے کے سبب دہقان زادوں کی کلہاڑیوں کی ضربیں بھری نہیں تھیں بلکہ گرد وغبار سے مٹیالی ہو گئی تھیں —— درخت کی جڑیں زمین میں پیوست ہونے کے علاوہ شاخوں سے سر نکال کر فضا میں بھی معلق ہو چکی تھیں —— فضا میں معلق جڑیں اس کے بالوں کی طرح لمبی، غلیظ اور سالجھی ہوئی تھیں ——

جب ذرا تیز ہوا چلتی تو درخت سے پاگل پن کے آثار جھلکتے ——

درخت کے تنے میں بے شمار چھوٹے اور بڑے سوراخ تھے جن میں لاتعداد چیونٹیوں کی آمد و رفت جاری تھی —— یہ چیونٹیاں آتے جاتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے آ کر ذرا دیر کو رکتیں کوئی ناقابلِ فہم اشارہ دینے اور وصول کرنے کے بعد اپنے اپنے راستوں پر روانہ ہو جاتیں ——

سخت گرمیوں کی بے رحم دوپہروں میں دھوپ ہٹا چھاؤں پھیلاتا یہ درخت راہ گیروں کو انتہائی مہربان اور شاندار لگتا تھا —— جس دن آسمان پر کالے بادل چھا جاتے اور بدن کو جھلسا دینے والی گرم لُو ایک بار پھر نرم و لطیف ہوا کی شکل اختیار کر لیتی تو وہی مہربان اور شاندار درخت بے مصرف اور ناچیز دکھائی دیتا —— دہقان زادوں کی کلہاڑیوں کی ضربیں شاید انہی دنوں کی نشانیاں تھیں ——

جاڑوں میں اس زمانہ دیدہ درخت کے خوبصورت بھرے بھرے شوخ سبز رنگت والے پتے زرد رُو اور کھوکھلے ہو جاتے اور خوف زدہ کر دینے والی سرد راتوں کی چیختی چلاتی ہواؤں میں یکے بعد دیگرے

زمین پر گرتے اور یا تو نشیب میں بہنے والی پُر پیچ و تاب ندی کے پانی میں شامل ہو کر دُور دُور تک نکل جاتے یا مخالف سمت کی ہوا چلنے پر خشکی کا سفر اختیار کرتے اور کچھ دنوں میں خاک ہو جاتے ——

سردیوں کے موسم میں درخت کی عُریاں شاخیں آسمان کی طرف دستِ احتجاج کی طرح بلند رہتیں لیکن چھوٹے دنوں کے خوف سے مسافر اپنے سفر پہ تیزی سے گامزن رہتے اور درخت سے لاتعلقی اختیار کر لیتے ——

لاتعلقی کی صورت میں کوئی چیز عظیم لگتی ہے، نہ حقیر ——

بوڑھا درخت زمین سے اچانک سر اٹھا دینے والی ایک ایسی سرسبز و شاداب پہاڑی کے ساتھ ہی زمین سے اُبھرا تھا جس کا بظاہر نزدیک کے بلند و بالا پہاڑوں سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا —— درخت کے عین درمیان پہاڑی کی نچلی سطح سے ایک بہت بڑا سیاہ پتھر نکلا ہوا تھا جس کا باہر کا حصّہ درخت کے تنے کے پہلے دو شاخے سے ٹکا ہوا تھا —— پتھر کی جسامت اُسے ایک چٹان کی شکل میں پیش کرتی تھی —— اگر پہاڑی کو مداری کا منہ فرض کر لیا جاتا تو وہ کالی چٹان اُس گولے کی طرح لگتی جو مداری کے منہ سے آدھا نکل آیا ہو اور درخت مداری کی اُس انگلی کی جگہ لے لیتا جس سے اس نے لوہے کے گولے کو منہ سے آدھا نکل آنے پر روکا ہوا ہو —— یوں محسوس ہوتا کہ اگر مداری کو پیسے توقع کے مطابق نہ ملے تو وہ گولے کو پھر منہ میں غائب کر دے گا —— پتھر کے نیچے گھاس کے تنکوں سے اَٹی ہوئی بھوری مٹی ہمیشہ گیلی رہتی اور اکثر اُس کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلے بغیر کسی بیرونی عمل کے از خود ٹوٹ کر لڑھکتے اور درخت سے ٹکرا کر یا نہ ٹکرانے کی صورت میں ذرا سا آگے نکل کر رُک جاتے ——

درخت سے چند قدم کے فاصلے پر گھاس سے لدے ہوئے ایک کونے سے پانی کا سوتا پھوٹتا تھا —— زمین کی تہوں سے پھوٹنے والا یہ پانی ہلکی سی خوش ذائقہ ترشی لئے ہوئے تھا جو اس میں تیرنے والی جڑی بوٹیوں کے اثر سے تھی ——

پانی چونکہ زمین کی کوکھ سے نکلتا تھا اس لئے باہر کے بدلتے ہوئے موسم اُس پر اثر انداز نہ ہو پاتے

اور وہ اپنا درجہ حرارت یکساں رکھتا ــــــ جب زمین کے اُوپر برفیلی ہوائیں چلتیں تو پانی میں بے حد لطیف حرارت کا احساس ہوتا اور گرمیوں کے موسم میں بھی پانی فرحت بخش ٹھنڈک لئے بہتا ــــــ اس عمل کو گاؤں والے گرمیوں میں پانی کا ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہو جانا کہتے تھے ــــــ یہ ان کے بیان کا حُسن تھا ــــــ

انتہائی پیچیدگی یا انتہائی سادگی حسنِ بیاں کو جنم دیتی ہے ــــــ

چٹان کتنا عرصہ پہلے پہاڑی سے نکلی تھی؟ ــــــ درخت عمر کے کس حصّے میں داخل ہو چکا تھا؟ چٹان نے درخت کے جوان ہونے کے بعد پہاڑی سے سر نکال کر اس کی کمر خمیدہ کر دی تھی یا درخت چٹان کے زیرِ سایہ نکلا تھا اور اُسے اپنے پہلو سے لگاتے ہوئے اوپر نکل گیا تھا؟ ــــــ

اِن سوالوں کے جواب گرد و نواح کے دیہاتوں کے ان بوڑھوں کے پاس بھی نہیں تھے جو اپنی عمر کی صدی مکمل کرنے کی حد میں داخل ہو چکے تھے اور جنہوں نے اپنے بچپن میں جنگل سے گھاس اور جلانے کی خشک لکڑیاں لاتے ہوئے اس چٹان اور درخت کو یوں ہی دیکھا تھا اور اب دن بھر کھاٹ سے لگے اپنے بیٹوں اور بہوؤں کے بعد اپنے پوتوں اور ان کی بیویوں کی جھڑکیاں سنتے رہتے تھے ــــــ

درخت اندر سے خاصی بلندی تک کھوکھلا ہو چکا تھا اور میدان کے ساتھ اس کے تنے میں ایک خوفناک حد تک بڑا شگاف پڑ چکا تھا جس میں سے ایک عام چوڑائی رکھنے والا آدم زاد با آسائش گذر سکتا تھا ــــــ شگاف تنے کے پہاڑی رُخ پر واقع تھا ــــــ تنے کے کھوکھلے حصّے کو اس کی خواب گاہ مان لینے کی صورت میں چٹان کو برآمدے کی چھت کی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی ــــــ

اس درخت کے نیچے یا اندر وہ بیٹھتا اور سوتا تھا ــــــ

اس کے شانوں کا درمیانی فاصلہ اگر کسی کوتاہ قد کو نصیب ہوتا تو بے ہنگم لگتا لیکن اس کی طویل القامتی پر سجتا تھا ــــــ اُس کے ناتراشیدہ بال لٹوں کی صورت شانوں پر بکھرے رہتے اور گرد و غبار میں اٹے ہوتے کے باوجود دیکھنے والے کے لئے جاذبِ نظر ثابت ہوتے ــــــ اس کی پلکیں دُھول بھری ہونے کے باوجود یہ بتانا نہ بھولتی تھیں کہ وہ غیر معمولی آنکھوں کی پردہ دار ہیں ــــــ جب وہ پلکیں جھپکاتا

تو یہ بھید کھلتا کہ خانقاہوں میں بیٹھنے والوں نے لفظ "غمزہ" کو آسمانی معنی کیوں پہنائے تھے ــــ اس کی جلد کی حقیقی رنگت معلوم کرنا خارج از امکان ہو چکا تھا ــــ وہ بظاہر غلط نظر آنے والے اس مفروضے کو صحیح ثابت کرتی دکھائی دیتی تھی کہ سخت کوشی کی زندگی ایک ہی جگہ بیٹھ کر بھی گذاری جا سکتی ہے ــــ

اس کی آنکھوں میں تمام موسم اپنی تمام تر سفاکیوں اور مہربانیوں کے ساتھ موجود تھے ــــ وہ کبھی نمناک ہوتیں کبھی خشک، کبھی روشن ہوتیں اور کبھی اُن کے دُور دراز گوشوں میں تاریکی مکڑی کے جالوں کی طرح لٹکی ہوئی نظر آتی ــــ وہ ایسی آنکھیں تھیں جن کے بارے میں با آسانی دو انتہائی آرا قائم کی جا سکتی ہیں ــــ یہ کہ انہیں ایک بے حد تیز دماغ کی پشت پناہی حاصل ہے یا یہ کہ ان کے پیچھے ایک ایسا ذہن کارفرما ہے جس میں خلا ابھر چکا ہے ــــ ان آنکھوں میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی چیز سُرخ ڈورے تھے ــــ یوں لگتا جیسے کسی شیشے میں دراڑیں پڑی ہوں ــــ

اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی دائمی شکن کسی چیز سے اس کی مستقل ناراضگی کی غماز تھی ــــ ہر چند کہ مسلسل کم خوراکی اس کے بدن کی ظاہری دیدہ زیبی کو پامال کر چکی تھی لیکن اس کی ہڈیوں کے پنجر کی ساخت بے حد مضبوط تھی ــــ اُسے اِس حالت میں دیکھ کر ایسا قلعہ تصور میں اُبھرتا جو سالخوردگی کے باعث ڈھنے والا ہو ــــ

ظاہری احوال سے اس کی عمر کا تعین کرنا اگر ناممکن نہیں تو بعید از قیاس ضرور تھا ــــ جب درخت پر آ بیٹھنے والے کسی پرندے کی آواز سن کر وہ سر اُٹھا کے مسکراتا تو یوں لگتا جیسے وہ زمین اور آسمان کے درمیان وقوع پذیر ہونے والی ہر بات سمجھتا ہے ــــ جیسے وہ موجودات کا احاطہ کئے ہوئے ہے ــــ جیسے وہ حرفِ آخر ہے ــــ

یہی مسکراہٹ اس وقت بھی اس کے چہرے پر نمودار ہوتی جب درخت کی گلہریاں اس کے کندھوں پر سے ہوتی ہوئی گود میں اتر آتیں ــــ وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس جنگلی چیونٹی کو بھی دیکھتا جو درخت پر چڑھتی یا اترتی ہوئی کسی گلہری کے پاؤں سے ٹکرا کر نیچے گرتی، کچھ دیر دائرہ مار

گھومتی اور حیرت انگیز طور پر اپنی قطار کو دوبارہ تلاش کر لیتی ــــــ

اس تبسم کے دوران اس کی پیشانی پر پڑی دائمی شکن بے حد نمایاں ہو جاتی اور وہ ایسے بادلوں کی طرح دکھائی دیتا جو اپنے دامن میں بہ یک وقت پانی اور بجلی لئے پھرتے ہیں ــــــ

عجیب بات یہ تھی کہ حیوانی سطح پر بودو باش رکھنے کے باوجود اس کی ذات میں کوئی کھنڈر نہیں اُبھرا تھا ــــــ اس کی نشست و برخاست میں کسی طرح کی کجروی کے آثار نہیں پائے جاتے تھے ــــــ اس کے آس پاس کوئی خالی پن نہیں دکھائی دیتا تھا ــــــ یوں لگتا گویا اس طرز پہ زندگی بسر کرنا اس کی فطرت کے عین مطابق ہو ــــــ

گرد و نواح کے دیہاتوں میں اُس کے بارے میں اُٹھائے جانے والے تمام سوالوں کے جواب میں تین افواہیں گردش کرتی تھیں ــــــ پہلی یہ کہ اپنے بھائیوں کی طرف سے وراثت کی تقسیم میں ناانصافی ہونے پر وہ خاموشی سے ہر چیز سے دستبردار ہو گیا تھا ــــــ دوسری یہ کہ ایک دن وہ اپنے بچوں کی ماں کو ناگفتنی حالت میں دیکھ کر کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر گھر بار چھوڑ کر یہاں چلا آیا تھا اور تیسری یہ کہ ایک موقع پر بھری محفل میں پُرانے دوستوں کی باتیں سنتے سنتے وہ اچانک کبھی نہ لوٹنے کے ارادے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا ــــــ

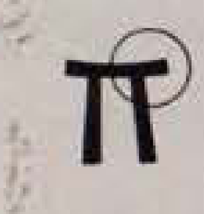
حقیقت کا علم بہر حال کسی کو نہیں تھا اور یہ تمام باتیں ثبوت کو ترستیں اور قیاس آرائیوں کے زُمرے میں آتی تھیں ــــــ

پھر یوں ہوا کہ ایک دن لوگوں کو کائنات کا وہ گوشہ تہس نہس ملا ــــــ درخت، پتھر اور وہ تینوں ختم ہو چکے تھے درخت نہ صرف گر چکا تھا بلکہ جل کر راکھ بھی ہو گیا تھا ــــــ ہر شخص اس انہونی کی تاویل اپنی بساط کے مطابق کر رہا تھا ــــــ مثلاً یہ کہ چٹان کے نیچے کی مٹی اس سال ہونے والی بے پناہ بارشوں کی وجہ سے بیٹھ گئی تھی اور کہنہ درخت چٹان کا مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکا تھا ــــــ

حادثے کی دوسری اور تیسری ممکنہ وجوہات بالترتیب یُوں بیان کی گئیں ــــــ درخت کے سوکھے حصّے کو اُس کی مشعل سے آگ لگی اور جل کر کمزور ہونے پر وہ چٹان کا وزن سہارنے کے قابل نہ رہ سکا تھا۔

— درخت اپنی کہنگی کے باعث چٹان کو ساتھ لئے ہوئے خود گر گیا تھا اور گرنے کے بعد اس کی مشعل کے شعلے کی لپیٹ میں آ گیا تھا —

حادثے کی وجہ کچھ بھی رہی ہو مگر یہ بہر حال حقیقت تھی کہ اُس کی موت چٹان کے نیچے دب جانے سے واقع ہوئی تھی —




آفرینش

ہم میدانوں کے رہنے والے لوگ تھے ——

ہم میدانوں کے رہنے والے لوگ تھے —— اور ہموار سطح پر ہماری انگلیاں نہیں کپکپاتی تھیں اور آنکھیں نہیں جھپکتی تھیں اور بندوقوں کے رُخ قائم رہتے تھے اور گولیاں خطا نہیں ہوتی تھیں —— یہی وجہ ہے کہ ہمارے گھروں کے گودام شکار سے بھرے رہے اور ہم سفید پوشوں میں رنگین پوشاکی کے درجے تک پہنچے اور معزز کہلائے ——

ہم آرام سے سوتے تھے اور خوشی سے جاگتے تھے اور مزے سے شکار کرتے تھے کہ ایک دن یہ بوڑھا کہیں سے چلا آیا اور ہمیں بڑے شکاروں کی طرف راغب کر کے پہاڑوں پر لے آیا اور ناہموار سطح پر ہماری انگلیاں کپکپائیں اور آنکھیں جھپکیں اور بندوقوں کے رُخ قائم نہ رہ سکے اور گولیاں خطا گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں پہاڑوں پر آئے زمانہ ہوا لیکن ہمارے فتراک اب تک خالی ہیں اور ہماری جیکٹیں جگہ جگہ سے اُدھڑ چکی ہیں اور ہمارے فل بوٹس برف کی کاٹ کے خلاف ناکافی ثابت ہو رہے ہیں اور اب ہم پہاڑوں پر بسنے والوں میں امتیازی حیثیت کے مالک نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ بدبختی کے ایسے چند مزید دنوں کے بعد اپنی شناخت مکمل طور پر گم کر بیٹھیں ——

جس دن ہماری شناخت ختم ہو گئی بوڑھے کا طلسم ٹوٹ جائے گا اور ہم سمجھ جائیں گے کہ ہم گمراہ ہوئے اور ناکام کر دیئے گئے مگر اس احساس کے سہارے ہم واپسی کے راستے طے نہیں کر سکیں گے جو برفباری کے طوفانوں میں بند ہو چکے ہیں ——

ہم سازوسامان سے لیس ہیں —— ہمارے پاس سات ایم —— ایم کی ٹیلی اسکوپک رائفلیں ہیں

اور پوائنٹ ٹو ٹو میں اور دو نالیاں اور سنگل بیرل چھرے والی بندوقیں ہیں مگر بوڑھا کہتا ہے کہ اونچی سطح پر شکار کرنے والے اس طرح کی غلطی نہیں کرتے اور یہ صرف میدان والوں کا طریقہ ہے کہ مختلف کارکردگی والی بندوقیں ساتھ رکھتے ہیں اور جو کچھ راستے میں آئے اُسے مارتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح چکوروں اور تیتروں سے لے کر پاڑوں اور نیل گائیوں تک سب کو ڈھا دیتے ہیں اور یوں عام شکاریوں کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں اور بہت جلد بھلا دیئے جاتے ہیں ——— وہ کہتا ہے کہ اونچی سطح پر شکار کرنے والے غیر ضروری بوجھ سے احتراز کرتے ہیں اور صرف اپنی سب سے طاقتور اور مہلک ترین اور جدید تر بندوق اُٹھاتے ہیں اور علاقے کی آب و ہوا میں زندگی کرنے والے سب سے کمیاب اور اعلیٰ اور دُشوار درندے کا تعاقب کرتے ہیں اور بالآخر اُسے مار گراتے ہیں اور اس طرح خاص افراد میں شمار ہوتے ہیں اور مدتوں یاد کئے جاتے ہیں ———

پہاڑوں پر بسنے والوں کے دلوں میں ہمارے لئے ہمدردی پیدا ہو چکی ہے ——— وہ کہتے ہیں کہ تم میدانوں کی چمکتی ہوئی زرخیزیوں پر آنے والے وافر شکار کو چھوڑ کر اُوپر کیوں چلے آئے جہاں تمہارا نظامِ تنفس ساتھ نہیں دیتا اور تمہارا خون کرچیوں کی شکل میں اٹک اٹک کر چلتا ہے اور تمہاری انگلیاں کپکپاتی ہیں اور آنکھیں جھپک جاتی ہیں اور گولیاں خطا ہوتی ہیں ——— وہ کہتے ہیں کہ صحراؤں میں جھیلیں خاصلوں پر ہوتی ہیں لیکن لذیذ پرندوں سے ڈھکی رہتی ہیں جو ہوا میں گولی چلانے پر قدموں میں ڈھیر ہو جاتے ہیں ——— "تم نے ایسی مہربان اور انسان دوست جھیلوں کے کنارے کیوں سکونت اختیار نہیں کی اور انہیں چھوڑ کر سرکش اور بے قابو موسموں میں کیوں داخل ہوئے ——— ؟؟"

ہم انہیں کس طرح بتائیں کہ ہمیں اس نامُراد بوڑھے نے بہکایا ہے جو جھیلوں کے کنارے شکار کرنے والوں پر ہنستا تھا اور کہتا تھا کہ یہ سب خود محرومیت کا شکار ہو چکے ہیں ———

ہم الاؤ کے گرد بیٹھے ہیں ———

ہم الاؤ کے گرد بیٹھے ہیں اور باہر برفباری ہو رہی ہے ——— ایسی راتیں جب چاروں اطراف برفباری ہوتی ہو اور آگ کی نزدیکی پر راحت محسوس ہو اور شعلوں کے حصار میں عافیت نظر آئے یا بہت طویل

ہوتی ہیں یا انتہائی مختصر ــــ یا بھاری ہوتی ہیں یا بے حد ہلکی پھلکی اور سکون بخش اور پُرکیف اور تازہ دم کر دینے والیں جیسے غیر متوقع طور پر کوئی ہمدردی کی بات سُننے میں آ جائے یا جیسے اپنی ذات سے اچانک کوئی نیک عمل سرزد ہو جائے جیسے خوشگوار دھوپ اور وافر شکار کے دن کوئی اپنے دوست کی زنبیل کا بوجھ اُٹھائے تاکہ وہ کچھ دیر اپنے ہاتھوں کو سکون دے سکے اور اُن کا دورانِ خون دُرست کر سکے۔

یہ رات جس میں ہم الاؤ کے گرد بیٹھے ہیں اور باہر برفباری ہو رہی ہے ــــ طویل رات ہے ــــ مگر بوڑھا کہتا ہے کہ پہاڑوں پر رہنے والوں کی زندگیاں اسی لئے طویل ہوتی ہیں کہ اُن کی راتیں طویل ہوتی ہیں اور دن مختصر ہوتے ہیں اور دنوں کا اختصار انہیں تیزی سے اور تندہی سے کام کرنے پر اکساتا ہے اور راتوں کی طوالت انہیں فراغت بخشتی ہے اور وہ آگ کے گرد بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کا سامنا کرتے ہیں اور باہم کہانیاں کہتے ہیں اور قصّے دُہراتے ہیں جس سے گذرے ہوئے لمحے اور لوگ یاد رہتے ہیں اور اجتماعی لاشعُور کا حصّہ بنتے ہیں اور اس طرح طویل زندگیاں پاتے ہیں ــــ

ایسی باتوں سے ہمیں اپنے رائیگاں جانے کا دُکھ شدّت سے محسوس ہوتا ہے اور ہم تہیّہ کرتے ہیں کہ ہم برفانی چیتے کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے چاہے ہمیں وائلڈ لائف والے بین الاقوامی سطح پر بُرا کہیں یا چاہے ہم ملکی قوانین کے تحت مجرم گردانے جائیں ــــ

بوڑھا ہمیں ان پُرعزم اور تجدیدِ وفا کے لمحوں میں انتہائی سچّا اور معصُوم معلوم ہوتا ہے اور اُس کے سر اور داڑھی کے سفید بال برف کے گالوں کی طرح محسوس ہوتے ہیں جو راتوں کی طوالت اور شدّت میں اضافہ کرنے کے باوجُود انہیں سیاہ ہونے سے بچا لیتے ہیں ــــ

ہم اپنے اس ساتھی کی طرف دیکھتے ہیں جو میدانوں پر دریا کے پھیلتے ہوئے دہانوں کے کنارے رہتا تھا اور رنگین پوشاکی اور خُوشحالی کی امتیازی شان کا مالک تھا ــــ اور جو ہموار سطح پر سینکڑوں ایکڑ میں پھیلے اپنے ذاتی بیلے میں رات کا شکار کھیلتا تھا ــــ اس کی "فور وہیلر" پہ سرچ لائٹ نصب تھی اور وہ جانوروں کو اس روشنی سے مسحُور کر کے خُود جیپ سے اتر کر اُن کے سروں پہ پہنچ جاتا تھا اور اس قدر آسانی اور فراوانی کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ نابالغ اور نشوونما پانے والی عمر کے جانور کو بُختہ کار ہونے

کے لئے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا تھا ـــــ اس کا بیان تھا کہ اس کی ذاتی شکار گاہ میں پلائے جانے والے پرندے اتنے بھولے اور مصائب سے ناآشنا تھے کہ بعض اوقات اُس نے اُن کی بے خبری میں اتنے نزدیک پہنچ کر فائر کیا کہ تمام چھرے ہوا میں پھیلنے سے قبل کسی ایک ہی چکور کے بدن میں پیوست ہو گئے اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ـــــ

ہمارا یہی ساتھی سب سے پہلے بوڑھے کی باتوں سے متاثر ہوا تھا اور اب اسی پر بد مزاجی کے دورے پڑتے ہیں اور وہ بوڑھے سے بے طرح اُلجھتا ہے ـــ "اگر فرق اسی بات سے پڑتا ہے کہ ہم کس سطح پر ہیں تو چیتے کا تعاقب کیا ضروری ہے؟ ہم انہی پہاڑوں پر مرغِ زرّیں کا شکار کر سکتے ہیں ـــ" ہمارے دریدہ دہن ساتھی نے آج صبح اپنے سوال کے ذریعے ہم سب کے خیالات کی ترجمانی کی تھی ـــ یہ سُن کر بوڑھے کے چہرے پر وہی مُسکراہٹ نمودار ہوئی تھی جو ہونٹوں کو متاثر نہیں کرتی لیکن آنکھیں چمکا جاتی ہے ـــ "مرغِ زرّیں سہلِ ممتنع کی مثال ہے ـــ" اُس نے جواب دیا تھا، "سوچو تو آسان اور گھات لگاؤ تو بہت مشکل ـــ اور تم جانتے ہو کہ جو آسان ہوتا ہے اُس کے حصُول میں ذرا سی دُشواری بہت کھٹکتی ہے اور شدید اضطراب کا باعث ہوتی ہے ـــ کیا تمہارے لئے یہی کافی نہیں کہ تُم اس کی تلاش میں ہو جس کا تصوّر نچلی سطح والوں کے لئے محال ہے ـــ؟" اس بات پر ہم نے پھر اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکالی تھیں اور سلیپنگ بیگز، تہہ کر دیئے تھے اور ڈروک سیک، پشت پر لاد کر چل پڑے تھے ـــــ

ہم نے تمام دن کڑی جدوجہد اور شدید مصائب میں گذارا تھا ـــــ اس لئے شام کے وقت وہی ہُوا تھا جو ناکامیوں کے دنوں میں ہمیشہ ہوتا ہے ـــ ہمیں ایک دُوسرے کے وجُود بھلے نہیں لگ رہے تھے ـــ ہماری کوتاہیاں اور لغزشیں نمایاں ہو گئی تھیں اور ہمیں اپنے ساتھیوں کی وہ تمام خامیاں ایک مرتبہ پھر نظر آنے لگی تھیں جو ہم اوجھل کر چکے تھے اور فراموش کر چکے تھے ـــــ

ہمارا اندرونی انتشار زبان تک پہنچنے لگا اور ہم میں سے ایک نے کہا، "ہم ابتری کی حالت کو یُوں پہنچے کہ ہم نے روا اور ناروا کا فرق مٹا دیا اور پاک اور جائز قرار دیئے گئے جانداروں کو ترک کر کے

اُس کی تلاش میں نکل آئے جو ممنوع ہے ـــــ اور اس طرح اپنی حد سے تجاوز کر گئے ـــــ"

"جب تک حد سے تجاوز نہ کیا جائے اپنی حد کا اندازہ نہیں ہوتا ـــــ" بوڑھے نے جواب دیا تھا" ـــــ اور اُونچی سطح پر جائز اور ناجائز کا درمیانی فاصلہ بہت باریک ہے اور اُلجھا ہوا ہے۔"

بوڑھے کی بات نے ہمیں ایک مرتبہ پھر اُن راستوں پر ڈال دیا تھا جہاں آدمی گم ہو جاتا ہے اور ڈوب جاتا ہے ـــــ

باہر برفباری ہو رہی ہے ـــــ

باہر برفباری ہو رہی ہے اور ہم آگ کے گرد بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کا سامنا کر رہے ہیں اور زندگی میں پہلی مرتبہ خود میں اور اپنے ساتھیوں کے وجود میں نئی دریافتیں کر رہے ہیں ـــــ اور پہلی مرتبہ ہم پر دریافتوں اور ایجادوں کا باہمی فرق واضح ہُوا ہے جو نچلی سطح پر ہمیشہ ہماری نگاہوں سے اوجھل رہا تھا ـــــ



